آپ بیتی نہ ہو جو ہے وہ کہانی بے لُطف
گرچہ ہوں لفظ فصیح اور زباں ٹکسالی

# آپ بیتی

نہایت ہی دلچسپ

اور

بے حد پُرلطف سچے فسانے

ڈاکٹر میر محمد اسمٰعیل

# پیش لفظ

اللہ تعالیٰ کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ لجنہ اماء اللہ ضلع کراچی کا صد سالہ جشن تشکر کی خوشی میں اشاعتِ کتب کا منصوبہ استقامت اور تسلسل سے آگے بڑھ رہا ہے۔ حضرت ڈاکٹر میر محمد اسمٰعیل صاحب کی شہرۂ آفاق کتاب 'آپ بیتی' اس سلسلہ کی چھیاسی ویں کڑی ہے۔ فالحمد للہ علیٰ ذالک

حضرت میر صاحب کے رشحات قلم کو سمیٹتے ہوئے سعادت کی نئی راہیں کھلتی گئیں 'مضامین حضرت ڈاکٹر میر محمد اسمٰعیل' کے بعد آپ کا منظوم کلام 'بخارِ دِل' بھی خوبصورتی سے طبع کروایا جا چکا ہے۔ اب 'آپ بیتی' جیسی انمول نایاب کتاب زیور طبع سے آراستہ ہو رہی ہے۔ اللہ تعالیٰ ہماری مساعی کو قبول فرمائے اور مثمر بثمراتِ حسنہ ہو۔ آمین

ہم اس کتاب کے پہلے ناشر محترم محمد اسمٰعیل صاحب پانی پتی کے لئے دعا گو ہیں جن کی مخلصانہ کاوشوں سے کتاب پہلی دفعہ طبع ہوئی۔ اللہ تعالیٰ اُنہیں غریقِ رحمت فرمائے اور درجات بلند فرماتا چلا جائے۔ ہم محترم طارق محمود صاحب پانی پتی کے شکر گزار ہیں جنہوں نے ہماری درخواست پر کتاب کی اشاعت کے حقوق لجنہ کراچی کو

تفویض کر دیئے پھر ہم نے نظارت اشاعت ربوہ سے بھی اجازت حاصل کی۔ فجزاہم اللہ تعالیٰ احسن الجزاء

عزیزہ امۃ الباری ناصر صاحبہ انچارج شعبہ تصنیف و اشاعت ہماری دعاؤں کی حقدار ہیں۔ میں اُن کو محترم مولانا دوست محمد صاحب شاہد (مؤرخ احمدیت) کے الفاظ میں دُعا دیتی ہوں۔ آپ نے تحریر فرمایا۔

”خدا تعالیٰ جزائے عظیم بخشے محترمہ امۃ الباری ناصر صاحبہ کراچی کو جنہوں نے بے پناہ دیدہ ریزی، کمال عرق ریزی، شبانہ روز تفحص اور محنت شاقہ سے حضرت میر صاحب کے اس گنج گراں مایہ کو دو جلدوں بعنوان 'مضامین حضرت ڈاکٹر میر محمد اسمٰعیل' میں محفوظ کر دیا ہے اور دونوں کی اشاعت لجنہ اماء اللہ ضلع کراچی کی رہین منت ہے۔“ (الفضل 6/اکتوبر 2006ء صفحہ 2)

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ ان کی معاونات کی ٹیم خاص طور پر محترمہ برکت ناصر ملک صاحبہ کو اجر عظیم سے نوازے اور خود ان کی جزا بن جائے آمین اللھم آمین۔

امۃ الحفیظ محمود بھٹی

صدر لجنہ اماء اللہ ضلع کراچی



# عرضِ حال

رحمٰن و رحیم رب العالمین اپنے خاص فضل و احسان سے کسی کو نتیجہ خیز سعی کی توفیق عطا فرماتا ہے انسان تو بے بس ہے۔ ہم حمد وشکر میں ڈوبے رَبِّ اِنِّی لِمَا اَنْزَلْتَ اِلَیَّ مِنْ خَیْرٍ فَقِیْر کی تصویر بنے اُس کے فضلوں کی بارش برستے دیکھ رہے ہیں۔ 'آپ بیتی' شائع کرنے کی سعادت عطا فرمانا بھی اُس کا احسانِ عظیم ہے۔ فالحمدللہ علیٰ ذالک

سلسلہ کے لٹریچر میں یہ منفرد خدانما، سبق آموز من موہنی کتاب جو اپنی نایابی کے باعث گویا ثریا پر جا بیٹھی تھی اب آپ کے ہاتھوں میں ہے۔ ہم نے کوشش کی ہے کہ اسے ہر ممکن خوبصورتی سے مزیّن کیا جائے۔ سہو کتابت کی اصلاح کی ہے۔ الفاظ کھلے کھلے لکھوائے ہیں پہلی مرتبہ انڈیکس ترتیب دیا ہے۔ پہلے اس میں مزاحیہ نظمیں شامل تھیں مگر اب سب نظمیں 'بخارِ دِل' میں یکجا کر دی گئی ہیں اس لئے اس نثری مجموعہ میں نظمیں شامل نہیں ہیں۔ ہماری دُعا ہے کہ اللہ تعالیٰ وہ اغراض و مقاصد پورے فرمائے جن کو مدِّنظر رکھ کر حضرت میر صاحب نے اپنی زندگی کے تجربات

وحوادث کو قلمبند کیا تھا۔

خاکسار اس موقع پر شعبۂ تصنیف و اشاعت کے لِلّٰہی خدمت گزاروں کے لئے دُعا کی درخواست کرتی ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنی خوشنودی اور رضا کی جنت عطا فرمائے اور تادمِ آخر مقبول خدمتِ دین کی توفیق عطا فرماتا چلا جائے۔ آمین اللھم آمین

خاکسار

امۃ الباری ناصر



# انڈیکس

| نمبرشمار | عنوانات | صفحہ |
|---|---|---|

## آپ بیتی

# (1) پچاس روپے

ایک دفعہ رات کے بارہ بجے گرمی کے موسم میں مجھے ایک شخص ایک مریضہ کو دیکھنے کے لئے بلانے آیا میں اپنے مکان سے جو سرکاری شفا خانہ میں تھا اُس کے ساتھ گیا۔ شہر میں جاکر دیکھا کہ مریضہ ایک نوجوان لڑکی تھی۔ جسے وضع حمل کی تکلیف تین دِن سے ہو رہی تھی۔ میں نے تفصیلی معائنہ کیا تو معلوم ہُوا کہ پہلا بچہ ہے اور پورے دِن ہو چکے ہیں۔ تین دِن سے درد ہے اور اب حالت نا قابلِ برداشت ہے۔ دائیاں سب جواب دے چکی ہیں۔ وجہ بچہ نہ ہونے کی یہ تھی کہ پیڑو کی ہڈیاں تنگ تھیں اور راستہ بچہ کے سائز سے بہت چھوٹا تھا۔ مگر بچہ ابھی تک پیٹ میں زندہ تھا اور ماں کی حالت بھی زیادہ خراب نہ تھی۔ میں نے کہا کہ بچہ سوائے آپریشن یعنی پیٹ چاک کئے بغیر نہیں نکل سکتا۔ ''وہ لوگ برہمن تھے کہنے لگے'' ہم صلاح کر لیں۔ اور آپ فیس کیا لیں گے؟ میں نے کہا پچاس روپیہ آج کل ایسے آپریشن کے لئے لوگ دو تین سَو سے کم نہیں لیتے مگر مجھے یہ خیال تھا کہ زیادہ فیس مانگنے سے یہ لوگ علاج نہیں کرائیں گے۔ اور ممکن ہے کہ صاحبِ وسعت بھی نہ ہوں۔

**مریضہ کا سسر:-** تو آپ زچہ بچہ دونوں کے بچ جانے کی اُمید رکھتے ہیں؟

**میں:-** زچہ کی تو بہت اُمید ہے مگر بچہ کے متعلق میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔ اس کی جان بہر حال خطرہ میں ہے۔

**وہ:-** پھر ہم اپنی برادری سے صلاح کر کے آپ کو اطلاع دیں

گے آپ تشریف لے جائیں۔

میں اپنی فیس جیب میں ڈال کر چلا آیا۔ رات تھوڑی سی باقی تھی اس وجہ سے انتظار میں جاگتے ہی گزری کہ وہ لوگ اب آتے ہوں گے، اب آتے ہونگے، مگر نہ آئے صبح کو میں شفاخانہ کے کام میں مصروف ہوگیا۔ دوپہر ہوگئی تو اُن کا پھر بھی کوئی پتہ نہ تھا۔ آخر شام کو خبر لگی کہ برادری نے کثرت رائے سے یہ فیصلہ کیا تھا کہ ''پچاس روپیہ بہت بڑی فیس ہے ہم نے ایسی گراں رقم بطور فیس کے کسی ڈاکٹر کو لیتے نہیں سُنی''۔ بعض نے کہا کہ ''موت زندگی تقدیر کے ہاتھوں ہے''۔ ایک صاحب بولے کہ ''سب کرموں کا پھل ہے جو کچھ ہوگا دیکھا جائے گا۔ بچہ جو ہمارا تخم ہے وہی اگر خطرہ میں ہے اور نہ بچ سکے تو بہو کے بچنے کا جو غیر کی لڑکی ہے ہمیں کیا فائدہ ہوگا''۔ غرض بہت کائیں کائیں ہوکر معاملہ ملتوی ہوگیا۔ مگر قدرت تو اپنا عمل پورا کرکے چھوڑتی ہے رفتہ رفتہ مریضہ کمزور اور بدحواس ہوتی گئی۔ آخر دِن کو دس بجے اُس نے پران چھوڑ دیئے۔ اب تو موت ہوگئی تھی بقایا برادری بلکہ سارا شہر جمع ہوگیا اور مُردہ جلانے کے لئے ارتھی تیار ہونے لگی کہ اتنے میں ایک پنڈت بولا۔

**پنڈت جی:-** بھائیو! یہ چھوکری بھرشٹ ہے۔ ہم اسے جلا نہیں سکتے۔ جب تک اس کے پیٹ کے اندر بچہ ہے۔ بچہ نکلے گا تو شاستروں کی رُو سے یہ مسان میں جلنے کے قابل ہوگی۔

**دوسرا برہمن:-** ہاں جی ہاں پنڈت جی نے بالکل سچ فرمایا۔ شاستر ارتھ یہی ہے۔

اس پر سب پنڈتوں نے اِتفاق رائے سے گھر والوں کو مجبور کیا کہ کسی دائی کو بلا کر بچہ ماں سے علیحدہ کیا جائے۔ مجبوراً مرنے والی کا سسر اُٹھا



اور ایک گھنٹہ کے بعد واپس آکر کہنے لگا کہ ''شہر کی سب دائیوں کے پاس پھر آیا ہوں کوئی اس پاپ کی حامی نہیں بھرتی کہ پیٹ چاک کرکے بچہ باہر نکالے اور پھر پیٹ کو سی دے۔ ہاں وہ جو ایک مسلمان دائی پہلے ہسپتال میں کام کیا کرتی تھی اُس نے کہا ہے کہ میں یہ کام کردوں گی۔ لیکن لیکن لیکن........ پچاس روپیہ دینے ہوں گے''۔ یہ سُن کر ساری برادری سناٹے میں آگئی اور ''ہے رام'' ''ہے رام'' ''ہے رام'' کا غلغلہ بلند ہوا۔

**ایک:-** اب کیا ہوگا۔ اس سے تو پچاس روپیہ ڈاکٹر ہی کو دے دیے ہوتے۔ اب دو جانیں گئیں اور پھر بھی اتنا ہی ڈنڈ باقی ہے۔ ہے پرمیشر!

**دوسرا:-** بھئی دیر ہوتی ہے۔ اَونے پَونے کسی طرح اُسے راضی کرو' کب تک مُردے کو گھر میں رکھ کر پاپ کماتے رہوگے۔

**سب یک زبان ہوکر:-** ہاں بھائیو! اب تو کچھ بھی ہو۔ اس پاپ سے چھُوٹنا ضروری ہے۔ جا بھئی منی رام تو جا اور دیکھ وہ دائی کچھ کم کردے تو لے آ۔

**ایک پنڈت جی بولے:-** ارے یار کم کرے یا نہ کرے تو اُسے لیتا ہی آئیو۔ گرمی کا موسم ہے۔ اب جلدی بندوبست کرنا چاہیے۔

آخر منی رام جی گئے تو دائی نے رقم کم کرنے سے بالکل انکار کر دیا مجبور ہوکر کہنے لگے۔ ''چل بھاگوان چل جو تُو مانگے گی ہم دیں گے''۔

**دائی:-** پنڈت جی مہربانی کرکے پیشگی پچاس روپیہ یہاں رکھ دیں تو حاضر ہوں ورنہ کہیں اور سے بندوبست کرلیں۔

پنڈت جی پھر بُڑبُڑاتے ہوئے گھر آئے۔ سب واقعہ سُنا کر پچاس روپے لے کر دائی کے ہاں پہنچے اور اس کی فیس ادا کی اس کے بعد دائی صاحبہ تشریف لائیں۔ ایک چاقو جیب سے نکال کر اور رومال ناک پر رکھ کر پیٹ اور

بچہ دانی میں اتنا بڑا شگاف دیا کہ بچہ اُس میں سے نکل سکے۔ یہ عمل کر کے بچہ کو ماں سے علیحدہ کیا۔ پھر چند ٹانکے لگا کر شکم کو سی دیا۔ باہر ''ہری ہر'' ''ہری ہر'' کا وظیفہ اونچی آوازوں سے ہو رہا تھا۔ دائی نے نوٹس دیا کہ ''تمہارا کام ہو گیا ہے اب میں جا رہی ہوں'' یہ کہہ کر وہ تو رخصت ہوئی اور مرنے والی اور بچہ کی ارتھی تیار ہو کر شمشان بھومی پہنچی اور وہی پچاس روپیہ جس سے غالبًا ایک اور شاید دو جانیں بھی بچ سکتی تھیں بے موقعہ اور برادری کے خوف سے خرچ ہُوا اور نتیجہ نکلا..........صفر۔

اور ابھی چند ماہ نہ گزرے تھے کہ چند ہزار مزید خرچ کر کے اس گھر میں پھر ایک 'بہو' نظر آنے لگی۔ مگر اُن پچاس روپوں کا ساری برادری کو مدتوں تک قلق اور صدمہ رہا۔

## (2) سات خون

ایک روز ایک پولیس کانسٹیبل تھانہ سے رپورٹ لایا اور کہنے لگا کہ ''پانچ لاشیں پوسٹ مارٹم کے لئے آئی ہیں۔ میں اُن کو سرکاری نعش خانہ میں رکھوا آیا ہوں''۔ میں نے پوچھا۔ ''کیا کہیں لڑائی ہوئی''؟ کہنے لگا ''نہیں خودکشی کا معاملہ ہے''۔ میں نے کہا ''اتنے آدمیوں کی اکٹھی خودکشی'' کہنے لگا کہ ''آپ پولیس کی رپورٹ پڑھ لیں۔ اس میں سارا ذکر ہے''۔

میں نے رپورٹ پڑھنی شروع کی تو معلوم ہُوا کہ ایک گاؤں میں جو قریب ہی تھا ایک زمیندار شخص کی دو بیبیاں تھیں۔ چونکہ آئے دِن اُن میں دنگا فساد رہتا تھا اس لئے اُس نے کچھ مدت سے اُن کو الگ الگ مکان میں رکھ دیا تھا۔ بڑی کے تین بچے تھے اور چھوٹی کے دو۔ اور وہ شخص اتنا منصف مزاج تھا کہ ایک مہینہ بھینس کو بڑی بیوی کے ہاں رکھتا تھا اور ایک مہینہ دوسری کے



ہاں۔ ایک دِن چھوٹی کو جو دودھ یا لسّی کی ضرورت ہوئی تو بڑی کے ہاں مانگنے گئی۔ کیونکہ اُس مہینہ میں بڑی بیوی کے پاس بھینس کی باری تھی۔ بڑی نے کچھ بے اعتنائی دکھائی جس سے چھوٹی پر غصہ کا جِن سوار ہو گیا۔ بس پھر کیا تھا آتے ہی ایک سکیم تیار کی اور جب بڑی کے تینوں بچے اس کے بچوں سے کھیلنے دوپہر کے وقت اُس کے گھر آئے تو کہنے لگی چلو آج سب کو جنگل میں جھڑ بیری کے بیر کھلانے لے چلوں یہ کہہ کر اپنے دونوں اور دوسری کے تینوں بچوں کو ہمراہ لیا اور گاؤں سے باہر چل پڑی سب بچے ہنسی ہنسی بھاگے چلے جا رہے تھے کہ گاؤں سے میل بھر پرے ایک کُنوئیں پر پہنچے۔ وہاں جا کر وہ کہنے لگی کہ ''آؤ ہم سب ناچیں اور گائیں''۔ یہ کہہ کر اپنے ساتھ سب کو کُنوئیں کی مُنڈیر پر چڑھایا اور اپنے ہمراہ جو ایک بڑی چادر لائی تھی اُس میں خود اپنے تئیں باندھا۔ پھر دائیں طرف چادر کے پلو سے سوکن کے تین بچوں کو اور بائیں طرف کے پلو سے اپنے دونوں بچوں کو باندھ دیا اور کہنے لگی آؤ کودیں اور اُچھلیں۔ اور آپ بھی کودنے اُچھلنے لگی۔ بچے یہی کوئی 3، 4، 5 سال کی عمر کے تھے وہ بھی کودنے لگے کہ اتنے میں وہ یکدم دھڑام سے کود کر کنویں کے اندر جا پڑی اور اُس کے ساتھ بندھے ہوئے سب بچے اندر پہنچ گئے۔ وہ کُنواں گو معطل اور غیر مستعمل تھا مگر اُس میں پانی بہت زیادہ اور گہرا تھا۔ نتیجہ یہ ہُوا کہ بچے سارے تڑپ تڑپ کر ڈوب گئے مگر عجیب بات یہ ہوئی کہ اس عورت کے گھگرے میں اندر کودتے ہوئے ہوا بھر گئی اور وہ گُبری کی طرح پانی کے اوپر گویا کھڑی رہی۔ ہوا نے اُسے ڈوبنے نہ دیا کمر تک وہ پانی میں تھی اور باقی حِصّہ اوپر۔ کچھ دیر کے بعد اُس نے جو بے تحاشا چیخیں مارنی شروع کیں تو اتفاقاً کچھ مسافر جو پاس کے ایک راستہ پر سے گزر رہے تھے۔ چیخیں سُن کر کُنوئیں پر آئے تو دیکھا کہ ایک عورت پانی پر بیٹھی ہے۔ وہ اپنی پگڑیاں باندھ

کر اُسے نکالنے لگے تو بوجھ کے مارے نکال نہ سکے۔ آخر ایک نے گاؤں جا کر اطلاع کی وہ لوگ رسّے اور آدمیوں کو ساتھ لائے۔ تب بمشکل ایک عورت اور پانچ اُس کے ساتھ بندھے ہوئے بچے باہر نکالے گئے۔

وہ سب تو مر چکے تھے مگر عورت بالکل چنگی بھلی تھی۔ اتنے میں اُس کا خاوند اور سوکن بھی خبر پا کر دوڑے ہوئے آئے۔ اُن کا رونا پیٹنا ناقابلِ بیان تھا۔ گویا اولاد پر جھاڑو پھر گئی تھی۔ خیر پولیس کو اطلاع ہوئی اور اب اُن بچوں کی لاشیں سرکاری لاش خانہ میں تھیں۔

میں پوسٹ مارٹم کے لئے وہاں پہنچا۔ عورت تو ضلع کے جیل میں تھی میں نے اُس وقت اُسے نہیں دیکھا۔ لیکن ان پانچ مُردہ بچوں کی قطار سنگدل سے سنگدل انسان کے دِل کو ہلا دینے کے لئے کافی تھی۔ خیر ملاحظہ ہُوا اور نتیجہ یہی نکلا کہ سب کی موت غرقابی سے ہوئی ہے۔ عورت پر اقدام خودکشی اور قتل عمد دونوں جرائم کے مقدمے چلے۔ وہ اس وقت جیل میں بند تھی اور ساتھ ہی دو اور ملزم عورتیں بھی بند تھیں۔ مقدمہ کی پیشیاں ہو رہی تھیں اور عدالت میں لوگ خونی آنکھوں سے اُسے دیکھتے تھے۔ خاوند نے اس کے لئے کوئی وکیل کھڑا نہیں کیا۔ خود عورت ہر بات کی اقبالی تھی اور بار بار عدالت سے مخاطب ہو کر یہی کہتی تھی کہ ”مجھے پھانسی چڑھا دو“۔ ”مجھے پھانسی چڑھا دو“۔ ایک دِن یہ اتفاق ہُوا کہ دوسری دونوں عورتیں اپنے جُرم سے بُری ہو کر جیل خانہ سے رہا ہو گئیں۔ صرف وہی اکیلی زنانہ وارڈ کے اندر رہ گئی۔ جو عورتیں چلی گئی تھیں اُن کے سرکاری کپڑے ابھی وہیں اُسی کمرے میں پڑے تھے۔ اُس عورت نے اُن کی دونوں چادروں کو تیسری اپنی چادر کے ساتھ ملا کر اور گانٹھ کر ایک لمبا رسّہ بنا لیا۔ پھر کسی طرح اونچی ہو کر روشندان کی سیخ سے اُس رسّے کا ایک سرا باندھ دیا اور دوسرے سرے سے لٹک کر پھانسی لے لی۔ اس طرح اس کا قصہ تمام



ہوا۔ خس کم جہاں پاک۔ جیل کی جمعدارن جب اُن عورتوں کے کپڑے لینے قفل کھول کر اندر گُھسی تو اور ہی تماشا نظر آیا۔ مگر ملزمہ مر چکی تھی۔ اس کی لاش ان بچوں کی لاشوں کے ایک ماہ بعد پھر میرے پاس ہی پوسٹ مارٹم کے لئے آئی۔ اور جب اس کا پیٹ چاک کیا گیا تو رِحم کے اندر سے ایک چار پانچ ماہ کے قریب کا بچہ اور نکلا اس طرح سات خون پورے ہو کر یہ ڈراما تکمیل کو پہنچا۔

میرے لئے صرف ایک بات اس واقعہ میں قابلِ تعجب تھی۔ وہ یہ کہ جو شخص ایک دفعہ خودکشی کا اقدام کر لیتا ہے اور بچ جاتا ہے وہ پھر دوسری دفعہ خودکشی نہیں کیا کرتا۔ یہاں یہ قاعدہ ٹوٹ گیا۔ غالبًا اس عورت نے دیکھا کہ میرا اب دُنیا میں کوئی ٹھکانا نہیں رہا نہ کوئی ہمدرد۔ اور یوں بھی پھانسی ہی ملنی ہے۔ تو چلو اپنے آپ کو خود ہی یہ سزا دے لو۔ یا یہ وجہ ہو گی کہ پہلی خودکشی کی اصلی تلخی اُس نے چکھی نہ تھی یعنی کوئی غوطہ لگا نہ تھا۔ بلکہ صحیح سلامت یونہی نکل آئی تھی۔

## (3) کایا پلٹ

1911ء میں جب امرتسر سول ہاسپٹل میں متعین تھا تو ایک عورت کو اس کے وارث یا شاید پولیس والے میرے پاس اس کی ضربات ملاحظہ کرانے کے لئے لائے۔ کسی ناواجب جھگڑے میں اس عورت کے بعض سسرال والوں نے اس کو خوب پیٹا تھا۔ میلے اور خون کے بھرے ہوئے کپڑے جن کی بدبو سے دماغ پھٹا جاتا تھا۔ منہ سارا سُوج کر کُپا اور نیلا ہو رہا تھا۔ آنکھوں کے پپوٹے بوجہ ورم کے کُھل نہ سکتے تھے۔ سر کے بال خون سے جمے ہوئے تھے۔ ہونٹ متورّم اور منہ سے رال ٹپک رہی تھی۔ غرض یہ کیفیت تھی جب میں نے اس کی مکروہ شکل کا تفصیلی معائنہ کیا اور سرٹیفکیٹ دے کر کہہ دیا کہ مرہم پٹی

کے لئے اسے داخلِ شفا خانہ کر دیا جائے۔ جب میں روزانہ شفا خانہ جایا کرتا تو اس کے منہ پر پٹیاں بندھی پاتا تھا۔ آخر دس بارہ روز کے بعد اس کا بھائی میرے پاس آیا کہ اب لڑکی اچھی ہے اسے گھر جانے کی اجازت دی جائے۔ میں نے کہا اچھا میں پٹیاں کُھلوا کر ایک نظر خود بھی اُسے دیکھ لوں۔ یہ کہہ کر میں نے اُسی آدمی کے ہاتھ ڈریسر کو مع مریضہ کے اپنے سامنے بلوا لیا۔ ڈریسر نے بھی کہا کہ ''اب زخم کوئی نہیں رہا۔ ورم سب اُتر چکا ہے۔ پٹی کی کوئی حاجت نہیں رہی''۔ خیر پٹی اُترنی شروع ہوئی۔ جب ساری اُتر گئی تو ڈریسر نے کہا کہ ''آپ دیکھ لیں اب یہ جا سکتی ہے یا نہیں''؟ میں نے سر اُٹھا کر جو اُس کے چہرہ کو دیکھا تو معلوم ہُوا کہ جیسے اندھیری رات میں چاند نکل آیا ہے۔ گورا رنگ کتابی چہرہ، رسیلی آنکھیں برف کی طرح سفید دانت، ازحد خوبصورت ناک، غرض چہرہ تھا یا حُسن کی کان۔ مَیں جھجک کر رہ گیا اور بے ساختہ میری زبان سے نکلا کہ ''یہ کس کو لے آئے ہو''؟ ڈریسر سمجھ گیا اور اُس عورت کا بھائی بھی' بھائی کہنے لگا کہ ''اسی کمبخت صورت نے تو اس کو پٹوایا اور مروایا تھا۔ اور یہ رقابت کا تو نتیجہ ہی تھا کہ اس بدنصیب کو ہسپتال میں رہنے کی ذِلّت دیکھنی پڑی تھی۔ آپ نے اس کو اُس وقت پٹی ہوئی حالت میں ملاحظہ کیا تھا آج یہ اچھی ہو کر اپنے پورے جوبن کے ساتھ کھڑی ہے۔ صاحب! کچھ تعجب نہ کیجئے۔ ہمارے لئے تو اس کا حُسن ہی ایک قہر الٰہی بن گیا ہے''۔ مگر میری نظر میں، دس دِن پہلے کی مکروہ شکل اور اس دِن کی چمک، دمک، قلبِ ماہیت یا کایا پلٹ کا ایک نمونہ تھی۔

## (4) شرک کا ایک نمونہ

مَیں ضلع ڈیرہ غازی خاں کے ایک مقام روجھان میں مقیم تھا۔ اس



علاقہ میں ایک مقبرہ رندانِ پیر کا ہے جو بہت بزرگ اور اہلِ اللہ سمجھے جاتے ہیں۔ اس علاقہ کے رہنے والے اکثر بلوچ قوم کے تھے اور وہاں خدا کی طرح رندانِ پیر کی بھی پرستش ہوتی تھی۔ خدا کی قسم جھوٹی کھانا معمولی بات تھی۔ مگر رندانِ پیر کی قسم کھا کر جھوٹ بولنا تباہی کے مترادف تھا۔ اور مقامی عدالت میں یا رندان کی قسم لی جاتی تھی یا وہاں کے نواب کے سَر کی۔ ایسی قسم کے بعد پھر کوئی گواہ جھوٹ نہیں بول سکتا تھا۔ ایک دِن میرے شفاخانہ میں ایک مریض آیا باتوں باتوں میں میں نے اُس سے پوچھا کہ ''تمہارے کتنے بیٹے ہیں''؟ اس سوال پر وہ کچھ خاموش سا ہو گیا پھر چشم پُرآب ہو کر کہنے لگا کہ ''رندان پیر نے دو بیٹے دیے تھے رب نے کھس لئے''۔ یعنی رندان نے تو دو بیٹے دیے تھے مگر خدا نے چھین لئے۔ یہ شرک کا ایک نمونہ تھا جو وہاں دیکھنے میں آیا۔

## (5) کفایت شعاری کا کمال

میرے ایک مہربان دوست تھے جو قریباً قریباً میرے کلاس فیلو تھے۔ وہ بی-اے کے پرائیویٹ امتحان کے لئے لاہور تشریف لائے' اور میرے مکان پر ہی قیام فرمایا۔ مگر تھے نہایت جزرس اور کفایت شعار' ایک دِن میں کالج سے گھر آیا تو دیکھا کہ جلیبیاں کھا رہے ہیں اور جلیبیاں بھی دو آنہ کی اکھٹی۔ حیران ہو کر میں نے پوچھا ''کہ حضرت! یہ فضول خرچی کیسی''؟ فرمانے لگے ''میں رات کو سوتا رہا، مطالعہ نہ ہو سکا، اس پر میں نے چاہا کہ اپنے نفس کے لئے کوئی سزا تجویز کروں پہلے تو خیال آیا کہ خدا کے نام پر دو آنے دے دوں۔ مگر دِل نے کہا کہ خیرات سے تو تیرے نفس کو خوشی ہو گی کیونکہ نیک کام ہے۔ اس لئے زیادہ مناسب یہ معلوم ہُوا کہ خود ہی دو آنہ کی جلیبیاں کھا لوں، تاکہ نفس کو سخت اذیّت اور دُکھ پہنچے اور آئندہ سُستی نہ کرے۔ سُبحان اللہ! دُنیا

میں ایسے بھی لوگ ہوتے ہیں جن کو خود اپنا مٹھائی کھانا کفایت شِعاری کی وجہ سے سزا اور دُکھ معلوم ہوتا ہے۔

## (6) تلخ تجربہ

آج کل تو چاروں طرف نوٹ ہی نوٹ چلتے ہیں۔ مگر میری ملازمت کے زمانہ میں چاندی کے روپوں کی افراط تھی۔ لیکن ساری عمر یہی تلخ تجربہ رہا کہ جب لوگ گھر پر بُلاتے تو اُن میں سے بہت سے اپنے گھر کے کھوٹے روپے کھروں کے ساتھ ملا کر بطور فیس جیب میں ڈال دیا کرتے۔ یہ بات ہمارے وقار کے خلاف تھی کہ اُسی وقت وہ روپے نکال کر اور بجا کر دیکھے جاتے۔ کئی حیادار ڈاکٹر اس طرح نقصان اُٹھاتے رہتے ہیں مگر دینے والے ٹھگوں کے نیک اعمال ڈاکٹروں کے اعمال ناموں میں منتقل ہوتے رہتے ہیں۔ میرے خیال میں تو اس قسم کے سَودے میں کوئی نقصان نہیں ہے۔

## (7) بہن کی عقلمندی

1916ء کا ذکر ہے۔ میں پانی پت میں تھا کہ ایک دِن عصر کے وقت پولیس ایک مضروب کو لائی اور حسبِ ذیل قصہ اُس کے ساتھ لکھا ہُوا آیا جس کا خلاصہ یہ ہے کہ ''مضروب کی بیوی دو بہنیں تھیں بیوی کا نام فرض کرو ریشم تھا اور سالی کا چاندنی۔ دونوں ایک ہی گاؤں میں بیاہی ہوئی تھیں، بلکہ دیوار بیچ دونوں کے گھر تھے۔ چاندنی کے میاں کا نام فرض کرو راموتھا۔ اُن کے بیاہوں کے کچھ دِن بعد سالی بہنوئی یعنی مضروب اور چاندنی میں مذاق ہونے لگا۔ پھر ناجائز تعلق ہوگیا۔ رفتہ رفتہ گاؤں میں اس کا چرچا ہوا۔ پھر تو چاندنی کے خاوند راموکو بھی غیرت آ گئی گرمی کا موسم تھا مضروب اور اُس کی زوجہ ریشم اپنے صحن



میں سو رہے تھے کہ رامو نے اپنے گھر سے اُن کے چھپّر پر آہستہ آہستہ آ کر ہل کا لوہا جسے پھل یا پھالی کہتے ہیں۔ سیدھا اس طرح مضروب کے اُوپر گرا دیا کہ وہ اُس کے پیٹ کے اندر گھس گیا مضروب نے غل مچایا۔ رامو کود کر واپس اپنے گھر میں اُتر گیا۔ گاؤں میں ایک ڈاکٹر رہتا تھا اُس نے آ کر وہ پھالی پیٹ کے اندر سے کھینچ کر نکالی۔ پھر دو تین ٹانکے لگا کر پیٹ کو سی دیا اور پولیس کو اطلاع دے دی۔ کیونکہ پیٹ کے ایسے زخم اکثر مہلک ہُوا کرتے ہیں۔ خیر مضروب ہمارے شفاء خانہ میں آ گیا۔ جہاں وہ ایک دو ماہ زیرِ علاج رہا مگر جاں بر نہ ہو سکا۔ اس کے سارے پیٹ میں پیپ بھر گئی اور دو دفعہ تو سیر سیر بھر نکالی گئی۔ جب وہ مر گیا تو پولیس نے رامو پر قتل کا مقدمہ چلایا۔ اس پر مضروب کی بیوی ریشم نے برادری کو جمع کیا اور کہا کہ ''مرنے والا تو مر گیا۔ اب اگر مقدمہ چلا تو رامو بھی پھانسی پا جائے گا اور ایک کی جگہ دو سگی بہنیں رانڈ ہو جائیں گی۔ ہم جوان ہیں جب سر پر کوئی محافظ نہ رہے گا تو ہماری بُری طرح مٹی پلید ہوگی۔ میری یہ تجویز ہے کہ جو گواہ بھی مقدمہ میں شہادت کے لئے بلایا جائے وہ عدالت میں اپنے پہلے بیان سے جو پولیس میں دیا تھا منحرف ہو جائے۔ نتیجہ یہ ہوگا ہم دونوں بہنوں کا ایک سرپرست اور محافظ تو رہے گا ورنہ ہماری عزتوں کا خدا ہی مالک ہے''۔ برادری نے اس کی اس عقلمندانہ تجویز پر صاد کیا۔ چنانچہ ایسا ہی ہُوا کہ شہادت تسلی بخش نہ ہونے کی وجہ سے رامو بچ کر چلا آیا۔ اور دونوں بہنیں برباد ہونے سے بچ گئیں۔ کیونکہ ہندوؤں میں شادی بیوگان تو ہوتی ہی نہیں اگر کوئی بیوہ جوان اور خوبصورت رہ جائے تو اس کا خدا ہی حافظ ہوتا ہے۔ اس عورت نے اپنی بہن کو بیوہ ہونے سے اور اپنے تئیں بے یار و مددگار ہونے سے بچا لیا۔ ایسے ہوتے ہیں دیہات کے پالیٹیکس (Politics)۔

جن قوموں نے دِیت یا خون بہا کے مسئلہ کو جائز رکھا ہے اُن کو ایسے
موقعوں پر دِقت پیش نہیں آتی۔ مگر افسوس ہے کہ موجودہ قانون میں ایسی کوئی
دفعہ نہیں۔

## (8) دو چور عورتیں

پانی پت میں میرے ہاں جب پہلی لڑکی (مریم صدیقہ) پیدا ہوئی تو
اُن دنوں انفلوئنزا زوروں پر تھا۔ لڑکی پیدا ہونے کے بعد اُس کی ماں نہایت
سخت بیمار ہوگئی۔ ادھر شہر میں موتا موتی لگ رہی تھی اِدھر ہمارے گھر میں سب
بیمار پڑے ہوئے تھے۔ خدا کی قدرت کہ لڑکی ابھی ہفتہ بھر کی تھی اور برلبِ گور،
کہ ایک لاوارث عورت وضع حمل کے لئے شفاخانہ میں آ گئی۔ رات کو اُس کے
ہاں بھی لڑکی پیدا ہوئی۔ پھر تو ہم نے اسے معقول تنخواہ اور کھانے کپڑے کے
وعدہ پر اپنے گھر دوسرے دِن ہی بلا لیا۔ خدا کا کرنا ایسا ہُوا کہ میری لڑکی کی
حالت سنبھلنے لگی اور وہ خدا کے فضل سے پَل گئی۔ ورنہ جب پہلی دفعہ اُسے دائی
کے سامنے لٹایا گیا تھا تو دائی نے پوچھا کہ لڑکی کا کیا نام ہے کسی نے کہا مریم۔
وہ دودھ پلانے والی کہنے لگی۔ تمہارے بچے اسی طرح سوکھ سوکھ کر مر جاتے
ہوں گے جو مَرْیَم نام رکھا ہے۔ خیر یہ تو جملہ معترضہ تھا۔ وہ دائی تو لڑکی کو دودھ
پلاتی تھی مگر ایک اور عورت لڑکی کے کِھلانے پر بھی رکھ لی گئی۔ یہ دونوں عورتیں
ازحد چور تھیں۔ گھر میں کوئی چیز کہیں پڑی ہو نظر جھپکنے میں غائب ہو جایا کرتی
تھی۔ ہم سخت تنگ اور حیران تھے۔ پتہ نہ لگتا تھا کہ دونوں میں سے کون چور
ہے؟ آخر ایک دِن ہمارے ہاں کہیں سے کچھ پیڑے آئے۔ میں نے اُن میں
سے چند پیڑے لے کر اُن پر ایک ایک قطرہ جمالگوٹہ کے تیل کا ڈال کر ایک
رکابی میں رکھ دیے۔ اور رکابی کارنس پر رکھ دی پھر خود اُس کمرہ سے ٹل گیا دو



گھنٹہ کے اندر اندر وہ سب پیڑے غائب تھے۔ اب ہم نے دونوں کو دیکھنا
شروع کیا کہ کس پر روغن جمالگوٹہ کا اثر ہوتا ہے۔ جو قَے کرے یا جسے اسہال
جاری ہو جائیں۔ بس وہی چور ہے۔ آدھ گھنٹہ کے بعد برآمدہ میں سے دائی کی
چیخیں سُنائی دیں کہ ہائے میں مری۔ میرے کلیجہ میں درد ہے۔ پاس گئے تو
اُسے پہلے تو اُبکائی آئی۔ پھر اُس نے سب کھایا پیا نکال دیا۔ اس کے بعد ہر
تھوڑے وقفہ کے بعد اسے استفراغ ہوتا رہا میں نے بیوی سے کہا ''یہی چور
ہے۔ خیر معلوم ہوگیا۔ اب تم اسے کچھ دہی پلا دو اسے آرام آ جائے گا''۔ مگر وہ
عورت یہی کہتی رہی کہ میرے کھانے کے ساتھ مکھی نگلی گئی ہے۔ یہ اُبکائی اسی
وجہ سے ہے۔ دو منٹ کے بعد مَیں برآمدہ سے نکل کر صحن میں آیا تو کیا دیکھتا
ہوں کہ پاخانہ میں سے کھلائی بڑھیا چیخیں مار رہی تھی۔ ''ارے کوئی سنبھالو مَیں
مری'' میری بیوی نے پاخانہ کا دروازہ کھول کر دیکھا تو معلوم ہُوا کہ اُسے اتنا بڑا
دست آیا کہ بیت الخلاء کا سارا فرش خراب ہو گیا ہے اور اُس کا تمام پاجامہ بھی
تربتر ہے اور اسہال کا سلسلہ ایسا جاری ہے گویا کسی نے نلکا کی ٹونٹی کھول دی
ہو۔ بے چاری بُڑھیا ایک درجن دستوں میں ہی نڈھال ہوگئی۔ اُس وقت پتہ
لگا کہ کمبخت دونوں برابر کی چور تھیں۔ خیر شام تک لشٹم پشٹم دونوں اچھی ہو
گئیں۔ اور اُن کو بھی ہماری حکمت کا پتہ لگ گیا۔ اس کے بعد انہوں نے پھر
کبھی کوئی چیز چرا کر نہیں کھائی اور ایک ہی نصیحت اُن کے لئے کارگر ہوگئی۔
ورنہ گھر میں کسی خوردنی شے کا کھلا رکھنا محال ہوگیا تھا۔

## (9) آج بیاہ کل ماتم

میاں الٰہی بخش ایک نوجوان روجھان میں میرے پاس کمپاؤڈر ہُوا کرتا
تھا۔ اس کا اصلی وطن راجن پور تھا۔ نہایت شریف اور فرمانبردار کارکن تھا ایک

دِن کہنے لگا کہ ''حضور ایک ہفتہ کی رخصت درکار ہے''۔ میں نے پوچھا ''کیوں''؟ کہنے لگا ''میرا بیاہ ہے اور گھر راجن پور جانا ہے''۔ خیر میں نے اُسے رخصت دے دی۔ چار پانچ دِن بعد جو میں شفا خانے صبح کے وقت آیا تو کیا دیکھتا ہوں کہ میاں الٰہی بخش منہ لٹکائے بیٹھے ہیں اور چہرہ سخت مغموم ہے۔ میں نے کہا۔ ''میاں الٰہی بخش کیا بیاہ کر آئے؟ ابھی تو دو تین دِن تمہاری رخصت کے باقی ہیں۔ اتنی جلدی کیوں کر آ گئے''؟ یہ کہنے کی دیر تھی کہ بچارہ رونے لگا بلکہ شاید کچھ چیخیں بھی نکل گئیں۔ میں نے کہا ''کیا معاملہ ہے؟ کیا بیاہ ملتوی ہوگیا''؟ کہنے لگا ''نہیں سائیں بیاہ تو ہوگیا تھا''۔

میں نے کہا۔ ''پھر کیا''؟ رو کر کہنے لگا۔ ''وہ مر بھی گئی'' میں تو حیران رہ گیا۔ میں نے پوچھا ''کیوں کر'' کہنے لگا ''سارا قصہ سُناؤں گا تو آپ سمجھیں گے'' پھر اُس نے سنایا۔

''آپ جانتے ہیں کہ ہمارے ملک میں دلہنوں کو مائیوں بٹھانے کی رسم ہے یہ رسم سارے ہندوستان میں رائج ہے مگر ڈیرہ غازی خاں کے ضلع میں اس کے ساتھ ایک اور مصیبت بھی ہے۔ ہمارے ہاں کے لوگ سیاہ فام زیادہ ہوتے ہیں اس لئے ایک مہینہ دُلہن کو مائیوں بٹھا کر پھر عین رُخصت والے دِن اس کی فصد کھولی جاتی ہے۔ اور فصد بھی نائی یا جرّاح نہیں لیتا بلکہ خاص عورتیں جو اس کام کی کاریگر ہیں وہی فصد لیتی ہیں اور اتنا خون نکال دیتی ہیں کہ دلہن کا رنگ سیاہی سے زردی کی طرف آ جائے تاکہ وہ نازک اور گوری معلوم ہونے لگے۔ چنانچہ بد بخت فصد لینے والی نے جب میری دُلہن کی فصد لی تو نشتر گہرا اندر چلا گیا اور ورید کٹ کر اُس کے نیچے جو بڑی شریان تھی وہ بھی زخمی ہوگئی۔ پھر کیا تھا خون اُبلنے لگا۔ کئی دفعہ پٹی باندھی مگر پٹی کے اندر سے بھی نکلتا رہا۔ غرض پٹی پر پٹی خون سے بھرتی تھی اور اُتار کر بدلی جاتی تھی۔ آخر رخصتانہ



کا وقت آ گیا۔ اُس طرح دلہن کو ڈولے میں بٹھا کر ہمارے ہاں بھیج دیا گیا۔ جب وہ سسرال میں آئی تو نیم بے ہوش تھی۔ رات بھر میں اُسے پٹیاں کس کس کر باندھتا رہا۔ آدھی رات کو وہ بے ہوش ہوگئی اور صبح اللہ میاں کے ہاں سدھاری۔ میں روتا پیٹتا یہاں چلا آیا''۔

حُسن نکھرنے کی جگہ اُسے قبر میں کھینچ کر لے گیا۔ اور ہنسی میں پھنسی ہوگئی۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ میاں الٰہی بخش بیاہے بھی گئے اور اسی دِن رنڈوے بھی ہوگئے۔

## (10) ملیریا کی تباہ کاری

کرنال کے ضلع میں غالباً سب اضلاع سے زیادہ ملیریا ہوتا ہے۔ کیونکہ پانی کی فراوانی ہے۔ اور ہر گاؤں میں اتنے اتنے بڑے جوہڑ ہیں کہ ان کی وجہ سے ملیریا نہ صرف وبائی رنگ میں پھوٹتا رہتا ہے بلکہ بہت سے دیہات میں تو مستقل رہائش اختیار کر لیتا ہے۔ رفتہ رفتہ ایسے گاؤں کی آبادی جس میں ملیریا کی اس قدر زیادتی ہو کم ہوجاتی ہے۔ مرد اکثر مرجاتے اور عورتیں بیوہ رہ جاتی ہیں۔ اور جو ذکور باقی رہ جاتے ہیں وہ زندہ درگور، پیلا رنگ، آنکھیں یرقان زدہ، پیٹ ایسا کہ تلی بڑھ جانے سے گویا نو ماہ کا حمل ہے۔ کام کاج کھیتی باڑی کی طاقت نہیں۔ اور سب سے بڑی بات یہ کہ اولاد ہونی بند ہو جاتی ہے۔ اسی طرح کا ایک گاؤں کرنال کے ضلع میں بھی تھا۔ ایک دِن سُننے میں آیا کہ صاحب ڈپٹی کمشنر بہادر کا ڈیرہ وہاں ایک دو دِن میں آنے والا ہے۔ (غالباً وہ لطیفی صاحب تھے) خیمے تنبو لگ گئے مگر گاؤں سے میل بھر پرے۔ ڈپٹی کمشنر صاحب آئے اور حکم دیا کہ صبح اس گاؤں کے نمبردار وغیرہ ہم سے ملنے آئیں۔ وقت دیا تھا دس گیارہ بجے کا مگر! ابھی آٹھ بھی نہیں بجے تھے کہ باہر شور وغل

ہونے لگا۔ صاحب گھبرا کر خیمہ سے باہر نکل آئے۔ کیا دیکھتے ہیں کہ چپڑاسیوں اور گاؤں کے بعض لوگوں میں تُو تُو مَیں مَیں ہو رہی ہے اور باقی اہل دیہہ جو پچاس ساٹھ کے قریب تھے ایک لائن باندھ کر فوجی طرز پر کھڑے ہیں۔ صاحب بولے۔ ''کیا معاملہ ہے''؟ چپڑاسی بولے۔ ''حضور! یہ زبردستی وقت سے پہلے حضور کے سلام کو آ گئے ہیں۔ اور بہت بیہودگیاں کر رہے ہیں''۔ جب صاحب ان لوگوں کی طرف متوجہ ہوئے تو وہ کہنے لگے کہ ''صاحب! بندوق لے کر کل تُو شکار کرتا پھرا ہے۔ پہلے ہمیں مار دے۔ ہمارا شکار کیوں نہیں کرتا۔ ہم تو آپ مرنے کے لئے آئے ہیں۔ گولی مار گولی۔ اس زندگی سے تو مر جانا اچھا''۔ صاحب گھبرا سے گئے۔ پوچھنے لگے ''آخر تمہارا مطلب کیا ہے''؟ ایک دو جو آگے کھڑے تھے وہ صاحب کو گاؤں والوں کی اُس لائن کے پاس لے گئے۔ ان کے وہاں پہنچتے ہی ساری لین والوں نے کرتے اُٹھا کر اپنے پیٹ ننگے کر دیئے۔ صاحب حیران رہ گئے۔ تو ان کا نمائندہ بولا ''اب تو دیکھ لیا۔ دیکھ تُو بڑا صاحب ہے۔ اس گاؤں میں کل یہ پچاس مرد ہیں جو تیرے سامنے کھڑے ہیں۔ اور دو سو عورت گاؤں کے اندر رانڈ بیٹھی ہے۔ یعنی بیوہ''

صاحب نے پوچھا: ''اور بچے؟'' بڈھا جاٹ بولا کہ ''سات سال سے اس گاؤں میں کسی کے ہاں بچہ نہیں ہوا۔ اب تُو ہی دیکھ لے ان مردوں کے پیٹ میں دو دو بچے ہیں۔ یہ تلّیاں ہیں تِلّیاں۔ منہ ان کے جیسے برسات کا زرد مینڈک' ہیں نا یہ گولی مارنے کے لائق؟ بندوق نکال لا اور ان کو مار دے''۔ یہ سُن کر وہ سب چلا اُٹھے ''گولی مار دے گولی مار دے گولی مار دے۔''

ڈپٹی کمشنر یہ حالت دیکھ کر سخت متاثر ہوا۔ کہا۔'' کیا مانگتے ہو؟'' وہ کہنے لگے۔ ''اگر ہم کو سرکار کسی اور ضلع میں زمین نہ دے گی تو ایک دو سال میں



اس گاؤں میں صرف رانڈ عورتیں ہی رہ جائیں گی مرد ایک نہیں رہے گا۔ ہم بہتیرا ضلع کی کچہریوں میں رو پیٹ آئے مگر آج حضور نے اپنی آنکھوں سے ہماری حالت دیکھ لی۔ اب یا ہم کو نیا گاؤں کسی اور ضلع میں بسانے دیں یا سب کو گولی مار دیں''۔

ڈپٹی کمشنر نے اُن سے وعدہ کیا کہ ''میں گورنمنٹ میں کوشش کروں گا کہ تمہاری یہ درخواست منظور ہو جائے۔ اب گھروں کو جاؤ'' پھر مجھے معلوم نہیں کہ اس قضیہ کا کیا حشر ہوا۔

## (11) کرنیل صاحب

میں میڈیکل کالج لاہور میں پڑھتا تھا۔ غالباً 1905ء کی بات ہے کہ ہم کئی طلبہ اکٹھے ایک جگہ جمع ہو کر رہنے لگے۔ ایک اُن میں سے ''کرنیل صاحب'' کے نام سے مشہور تھے۔ ایک دفعہ اُن کو کھانا ٹھیک نہ ملنے کی شکایت پیدا ہوئی تو انہوں نے شام کو کھانا کھانا ہی ہمارے میس (MESS) سے چھوڑ دیا کچھ دِن کے بعد کسی نے اُن سے پوچھا ''کرنیل صاحب! آج کل شام کا کھانا کہاں کھاتے ہو؟ کہنے لگے ''تمہیں کیا''؟ لڑکے بھی آخر لڑکے ہوتے ہیں۔ پتہ لگا ہی لیا کہ یہ ذات شریف روز شام کے قریب کسی اعلیٰ انگریزی ہوٹل میں چلے جاتے تھے اور وہاں دریافت کرتے کہ ''چائے کا کیا لوگے؟'' جیسا کہ رواج ہے خانساماں کہہ دیتے تھے کہ ''ایک روپیہ'' آپ فرماتے تھے۔ ''لے آؤ'' اور کونے کی ایک میز پر بیٹھ جاتے تھے اُن دنوں رواج تھا کہ انگریز ہی اکثر ہوٹلوں میں چائے پیتے تھے ہندوستانی بہت ہی کم' ہر چیز چائے کے ساتھ آتی تھی اور بڑی عزّت اور قرینہ کے ساتھ آتی تھی۔ یعنی چائے دانی بھری ہوئی۔ دودھ دانی مصری دان لبالب مکھن دانی جس میں پوری ٹکیہ مکھن کی

ہوتی تھی کچھ بسکٹ کچھ ٹوسٹ کچھ کیک دو انڈے جام کی بوتل وغیرہ وغیرہ۔ انگریز لوگ تو ایک دو پیالی، برائے نام دودھ، اور ذرا سی شکر ڈال کر ایک دو ٹوسٹ یا ایک بسکٹ کے ساتھ ناشتہ کر لیا کرتے تھے باقی سب چیزیں خانساماں لوگ واپس لے جاتے تھے۔ اور پینے والے ایک روپیہ فی کس اس چائے کی قیمت ادا کر کے چلے جاتے تھے۔ کرنیل صاحب نے جب اتنا سامان دیکھا تو منہ میں پانی بھر آیا اور خیال کیا یہ سب مال تو ایک روپیہ میں مفت ہے۔ خیر ان کے آگے حسب رواج جب چائے آتی تھی۔ تو پہلے تو وہ سارا بنڈل بسکٹوں کا نوش فرماتے۔ پھر سب ٹوسٹ۔ پھر ساری مکھن دانی چٹ کر کے انڈے کھا کر چمچے سے سارا جام وغیرہ اُڑا جاتے۔ اس کے بعد تمام دودھ اور مصری ساری چائے میں ملا کر مع کیک کے ہضم کرتے۔ غرض اُن کے آگے سے جب ٹرے اُٹھتی تو ایک ذرّہ بھی کسی چیز کا باقی نہ ہوتا تھا۔ جب ایک ہوٹل کے نوکر ان کی یہ حالت دیکھ کر بے اعتنائی کرنے لگتے تو آپ دوسرے ہوٹل میں جا کر وہی عمل وہاں شروع کر دیتے۔ یہی وجہ تھی کہ انہوں نے گھر پر کھانا کھانا ترک کر دیا تھا۔ آخر تابہ کے لاہور میں اُن دنوں چند ہی بڑے ہوٹل تھے۔ جب سب جگہ اُن کی اس "کم خوری" کا چرچا ہو گیا تو ہوٹل میں گھستے ہی خانساماں کہہ دیا کرتے کہ "صاحب چائے تیار نہیں ہے"۔ اس طرح خدا خدا کر کے ان کی وہ ہوٹل گردی بند ہوئی۔ آخر تعلیمی سیشن ختم ہو گیا اور اُن کے کمرہ میں کوئی اور طالب علم آ گیا اور یہ دیکھ کر بہت خوش ہُوا کہ کرنیل صاحب ایک بھری ہوئی مٹی کے تیل کی بوتل الماری میں چھوڑ گئے ہیں۔ اُن دنوں لاہور میں مال روڈ کے سوا دیگر کوٹھیوں اور مکانوں میں بجلی نہیں تھی۔ شام ہوئی تو اُس لڑکے نے خود یا نوکر سے اپنا لمپ اُسی تیل سے بھروا لیا۔ مگر جب جلا کر مطالعہ شروع کیا تو لمپ نے روشن ہونے سے انکار کر دیا اور تھوڑی دیر میں چڑ چڑ ہو



کر بجھ گیا دو تین دفعہ اُس نے پھر جلانے کی کوشش کی مگر ناکامی ہوئی۔ آخر اِدھر اُدھر کے لوگوں سے پوچھا تو معلوم ہُوا کہ یہ بوتل تو کرنیل صاحب نے مع قیف کے اپنے لئے رات کے وقت پیشاب کرنے کو رکھی ہوئی تھی۔ اور بجائے مٹی کے تیل کے درحقیقت اس میں روغنِ بول تھا وہ لڑکا بیچارا بڑا خفیف ہوا۔ پھر جو دوسری الماری میں دیکھا تو روزنامہ سول ملٹری گزٹ کی کئی بڑی بڑی پُڑیاں بندھی رکھی پائیں۔ اُنہیں بڑے شوق سے کھولا گیا تو کچھ نہ پوچھو کیا نکلا۔ کرنیل صاحب کا ..........فضلا!

## (12) بڑا بول

1907ء میں لاہور میو ہاسپٹل میں ہاؤس سرجن تھا کہ میری بڑی سالی ہمارے ہاں اپنی بہن سے ملنے آئیں شاید مہینہ بھر یا کم وبیش وہ ہمارے ہاں ٹھہریں۔ وہ نہ صرف میری سالی ہی تھیں بلکہ پھوپھی کی بیٹی بھی تھیں۔ آئی وہ اس طرح تھیں کہ اُن کے ہاں ایک لڑکی ہوئی تھی جو کچھ مہینے زندہ رہ کر مرگئی تھی۔ اُس کے مرنے کے صدمہ کو بھلانے کے لئے وہ اپنی چھوٹی بہن یعنی میری بیوی کے پاس آ گئیں۔ یہاں آ کر وہ ایک بات کا بار بار ذکر کیا کرتی تھیں۔ یعنی یہ کہ "اگر میرے بہنوئی ڈاکٹر صاحب (یعنی خاکسار) میرے پاس ہوتے تو میری لڑکی نہ مرتی"۔ جب انہوں نے کئی دفعہ اس قسم کا ذکر کیا تو مجھے خدا تعالیٰ کے متعلق بڑی غیرت آئی اور میں نے کہا کہ "اب اُن کے ہاں ضرور ایک لڑکا پیدا ہو گا اور وہ میرے زیرِ علاج رہ کر میرے ہی ہاتھوں میں مرے گا"۔ بات گئی آئی ہوئی۔ 1913ء میں خدا کا کرنا ایسا ہُوا کہ اُن کے ہاں ایک بیٹا پیدا ہوا۔ اُس کا چلّہ کر کے وہ اپنی بہن سے ملنے کے لئے مع اپنے بچہ کے ہمارے ہاں تشریف لائیں۔

تھرماس بوتلیں اُن دنوں میں نئی نئی نکلی تھیں۔ اور اُن کو یہ علم نہ تھا کہ ان بوتلوں میں گرم دودھ پھٹ جایا کرتا ہے۔ چنانچہ گرم دودھ جو اس چھوٹے بچہ کے لئے انہوں نے تھرماس میں رکھا تھا وہ پھٹ گیا اور سارے سفر میں وہی پھٹا ہُوا دودھ وہ اپنے بچہ کو پلاتی ہوئی ہمارے ہاں آئیں۔ دوسرے دِن سے لڑکے کو سبز دَست آنے لگے۔ دس یا پندرہ دِن تک میں نے جو بھی ہوسکا اُس بچہ کا علاج کیا اور دوسرے ڈاکٹروں سے بھی مشورہ لیا مگر بچہ کو نہ اچھا ہونا تھا نہ ہُوا اور دو ہفتہ بیمار رہ کر وفات پا گیا۔ اُن کے ہاں چونکہ اولاد کی کمی تھی اور بچہ بھی فرزند نرینہ تھا اس لئے ماں کو سخت صدمہ ہوا۔ اُس وقت مجھے وہ بات یاد آئی جو میں نے چھ سات سال پہلے لاہور میں کہی تھی کہ ''اُن کے ہاں لڑکا پیدا ہوگا اور وہ میرے ہاتھوں میں مرے گا تاکہ اُن کا شرک ٹوٹے''۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔

## (13) وہم کا اثر

ایک ڈاکٹر صاحب ایک شہر کے سول ہاسپٹل کے انچارج تھے۔ اور بہ سبب ضلع کا صدر ہونے کے وہاں سول سرجن بھی موجود تھا۔ قضارا پلیگ کا دور دورہ اُس شہر میں شروع ہوگیا۔ ڈاکٹر صاحب شہر میں جا کر پلیگ کے بیماروں کو بھی دیکھ لیا کرتے تھے۔ کیونکہ ایسے بیماروں سے معمول کی نسبت دُگنی فیس مل جایا کرتی تھی۔ کچھ مدت کے بعد ڈاکٹر صاحب نے ایک دِن صبح اُٹھ کر اپنے نوکر سے کہا کہ ''میری طبیعت کچھ خراب ہے۔ شاید بخار ہوگیا ہے۔ تُو ذرا یہ تھرما میٹر دھو کر لے آ''۔ جب نوکر تھرما میٹر دھو کر لایا تو ڈاکٹر صاحب نے اُسے اپنے منہ میں لگا لیا۔ دو منٹ کے بعد جو دیکھا تو ٹمپریچر ایک سو پانچ! ڈاکٹر صاحب وہمی بھی تھے، خیال ہُوا کہ طاعون ہوگیا۔ آخر



طاعون کے بیماروں کو دیکھنے کا نتیجہ یہی ہونا تھا۔ سر میں درد ہونے لگا۔ طبیعت زیادہ گھبرا گئی۔ پھر تھرما میٹر جھٹک کر نوکر سے دُھلوا کر لگایا تو وہی 105 بلکہ کچھ نکلتا ہوا۔ ''ہے رام رام۔ یقیناً یہ پلیگ ہے''۔ بدن کا رؤاں رؤاں جلنے لگا آنکھیں گویا سر میں سے باہر نکلی پڑی تھیں۔ آدھ گھنٹہ میں پھر تھرما میٹر لگایا تو ذرا سا اور زیادہ ہی نکلا۔ ہے پرمیشر کیا کروں! بیوی بچے بھی وطن گئے ہوئے ہیں۔ اپنا یہاں کوئی بھی نہیں ہے۔ ارے بُدھو جا کر ذرا کمپاؤڈر کو تو بُلا لا۔ وہ بچارا آیا تو دور ہی سے ڈاکٹر صاحب کہنے لگے ''بھئی نتھو رام! مجھے پلیگ ہوگئی ہے۔ بخار بہت تیز ہے اور اب تو دائیں ران میں گلٹی کے مقام پر درد بھی ہو رہا ہے۔ سر میں درد سخت بخار اور گلٹی اُوپر سے شہر میں پلیگ موجود اور کئی روز سے اس بیماری کے مریض بھی دیکھ رہا ہوں''۔ غرض کوئی شبہ نہیں رہا۔ مہربانی کر کے فوراً میرے گھر میں بذریعہ تار اطلاع دے دو کہ ڈاکٹر صاحب کو طاعون ہوگیا ہے اور حالت نازک ہے۔ اور تم یہ تھرما میٹر تو جھٹک کر اُتار دو۔ ارے بُدھو ذرا یہ تھرما میٹر تو دھو لا۔ بُدھو تھرما میٹر دھو لایا۔ لگایا تو 106 ہائے باپ رے باپ میں مرا۔ معلوم ہوتا ہے کہ دوسری طرف کی گلٹی بھی نمودار ہونے لگی ہے، ادھر بھی بہت سخت جلن اور درد ہے۔ کمپاؤڈر بھی گھبرا گیا اور کہہ گیا کہ ''تار تو ابھی دے دیتا ہوں اور سول سرجن صاحب آنے والے ہیں انہیں بھی خبر کر دیتا ہوں''۔ یہ کہہ کر وہ تو چلا گیا اُدھر ڈاکٹر صاحب کی حالت لحظہ بہ لحظہ خراب ہونے لگی۔ ہائے وائے بے قراری، درد، غرض، گھنٹہ بھر تک گھر کو سر پر اُٹھائے رکھا۔ ہسپتال کے عملہ کے لوگ برابر آتے جاتے رہے۔ مگر ڈر کے مارے دُور ہی کھڑے رہتے تھے کہ اتنے میں باہر سے آواز آئی کہ سول سرجن صاحب تشریف لا رہے ہیں۔ چلمن اُٹھی اور وہ اندر آ گئے۔ آتے ہی کہا۔ ''ویل ڈاکٹر صاحب

کیا حال ہے''؟ ڈاکٹر صاحب بولے۔ ''حال کیا ہے پلیگ ہوگئی ہے موت سر پر کھڑی ہے ایک سو چھ بخار ہے۔ دونوں طرف ران میں گلٹیاں نمودار ہیں سر پھٹا جاتا ہے عقل کچھ کام نہیں کرتی۔ ہائے مرا ہائے مرا''۔ سول سرجن صاحب نے چہرہ دیکھا تو کوئی تغیر نہ پایا نبض دیکھی تو تندرستوں جیسی بدن ٹھنڈا بخار کی کوئی علامت نہیں تھرمامیٹر جھٹک کر اُتارا پھر نوکر سے دھلوا کر منگایا۔ تو وہی ایک سو چھ (106) یہ کیا؟ ''ارے بدھو تھرمامیٹر کہاں دھوتا ہے''؟ ''حضور غسل خانہ میں جو گرم پانی کا بمبا ہے اُس کی ٹونٹی سے دھوتا ہوں''۔ ''اچھا ذرا گڑوی میں ٹھنڈا پانی تو لے آ''۔ جب اس پانی سے دھو کر اور جھٹک کر لگایا اور دیکھا گیا تو 98 یعنی نارمل ہات تیری پلیگ کی ایسی کی تیسی غسل خانہ میں بمبا جا کر دیکھا تو اس کا پانی سخت گرم تھا۔ اب پتہ لگا کہ یہ بمبے کے گرم پانی سے ہر دفعہ تھرمامیٹر چڑھ جایا کرتا تھا۔ ڈاکٹر صاحب کا مزاج واقعی کچھ کسل مند تھا مگر بخار، طاعون کا بخار نہ تھا۔ سول سرجن صاحب ہنس پڑے۔ پھر کہا کہ ''گلٹیاں تو ذرا دکھایئے''۔ وہاں دیکھا تو کچھ بھی نہ تھا صرف وہم علیہ اللعنۃ تھے اور بس۔ اب سر کا درد بھی جاتا رہا اور ڈاکٹر صاحب بھی ہنس کر اُٹھ بیٹھے کہنے لگے میں بھی کتنا بے وقوف ہوں۔ اگر آپ تشریف نہ لاتے تو میں تو مر ہی چلا تھا۔ ''ارے نتھو رام گھر تار دے دے کہ سب خیریت ہے''۔ مگر افسوس کہ دوسرا تار وقت پر نہ پہنچ سکا اور ڈاکٹر صاحب کی اہلیہ، بچے اور والدہ روتے پیٹتے دوسری صبح اُن کے پاس پہنچ گئے۔ پھر ہمیں معلوم نہیں کہ وہ ڈاکٹر صاحب سے مل کر خوش ہوئے یا ان کی بے ہودگی پر لعنت ملامت کرتے رہے۔ ہاں اتنا ہُوا کہ پھر ڈاکٹر صاحب نے کسی طاعون کے مریض کو باوجود ڈبل فیس پیش ہونے کے بھی نہیں دیکھا۔ اور کہا کرتے تھے کہ بابا ایک دفعہ تو بچ گیا ہوں مگر اب کے



نہیں بچوں گا''

## (14) عورت کی وفاداری

روجھان ضلع ڈیرہ غازی خاں کا ذکر ہے کہ ایک دِن ایک جوان عورت جس کی گود میں شاید دو سال کی ایک لڑکی تھی شفا خانہ میں آئی۔ اُس کے گلے میں بڑا سا گھیگہ جسے پنجابی میں گِلّھڑ اور انگریزی میں (Goitre) کہتے ہیں موجود تھا۔ ایک مرد بھی اُس کے ساتھ تھا۔ اُس نے کہا ''یہ عورت بیوہ ہے میں اس کا عزیز ہوں اور یہ اپنے گھیگہ کا آپریشن کرانے آئی ہے۔ صرف بدصورتی کی وجہ سے ورنہ اسے تکلیف کوئی نہیں ہے''۔ میں نے اُس عورت کو شفا خانہ میں داخل کر لیا اور دوسرے یا تیسرے دِن اُس کا آپریشن کر کے وہ گِلّھڑ نکال دیا۔ آپریشن نے زیادہ وقت لیا اور خون بھی کافی نکلا۔ پھر یہ کہ سخت سردی کا موسم تھا چنانچہ مریضہ کو چار پانچ روز کے بعد ڈبل نمونیہ ہو گیا اور وہ بھی سخت قسم کا۔ خیر علاج ہوتا رہا اور وہ خدا کے فضل سے بچ گئی۔ اور زخم بھی اچھا ہو گیا۔ مگر تقریباً ایک ماہ اُس کے علاج میں لگ گیا۔ جب وہ اچھی ہوئی تو ایسی کمزور زرد رنگ اور بے رونق ہو گئی تھی جیسے مہینوں کا بیمار، جوان عورت تھی مگر اب اُس کی خوبصورتی باقی نہ رہی تھی۔ آواز میں ضُعف تھا اور سوکھ کر کانٹا بن گئی تھی۔ مگر خیر تندرست ہو چکی تھی۔ میں جو ایک دِن اُس کے پاس حسبِ معمول روزانہ خیریت پوچھنے گیا تو بچاری رونے لگی۔ میں نے کہا ''کیا ہوا''؟ کہنے لگی جو آدمی میرے ساتھ آیا تھا وہ کہتا تھا کہ ''آج شام کو میں چلا جاؤں گا''۔

میں نے کہا: ''وہ پھر آ کر تجھے لے جائے گا۔ ابھی تُو کمزور بھی ہے کچھ دِن یہاں ٹھہر جا''۔ کہنے لگی وہ کہتا تھا کہ ''اب میں تجھے لینے نہیں آؤں گا''۔

میں نے پوچھا ''کیوں''؟ کہنے لگی ''اصل قصہ یہ ہے کہ جب میں بیوہ ہوگئی تو اس شخص نے مجھ سے عدّت کے بعد کہا کہ میں تجھ سے شادی کر لیتا مگر تیرا گھیگا مجھے بدصورت لگتا ہے۔ اگر تو روجھان والے ڈاکٹر سے اس کا آپریشن کرا لے اور تیری یہ بدصورتی جاتی رہے تو پھر میں ضرور تیرے ساتھ نکاح کرلوں گا میں راضی ہوگئی۔ پھر آپ نے دیکھ لیا کہ کس طرح میں نے اس کی خاطر تکلیف اُٹھائی۔ نمونیہ ہوا۔ مہینہ بھر زندگی اور موت کے درمیان لٹکتی رہی۔ میرے چہرے کا روپ اور جسم کا گدراپن سب جاتا رہا۔ اور جب میں اس کی خوشی کے لئے ہر طرح کی موت قبول کر چکی تو اب وہ کہتا ہے کہ تیری شکل اچھی نہیں رہی۔ تُو بدصورت ہوگئی ہے میں تجھ سے شادی نہیں کروں گا اور آج شام کو گاؤں چلا جاؤں گا''۔ میں نے اُسی وقت ادھر اُدھر آدمی بھیج کر اُس شخص کو ڈھنڈوا کر بلایا اور اُس کے سامنے سارا قصہ اُس عورت سے دوبارہ کہلوایا اور پوچھا کہ: ''کیا یہ سچ کہتی ہے''؟

وہ بولا: ''ہاں سچ کہتی ہے''۔

میں نے کہا کہ: ''ارے ظالم ایک دو ماہ میں اس پر پھر وہی رنگ و روپ چڑھ جائے گا۔ تو گھبرا نہیں''۔ مگر اُسے انکار ہی رہا۔ آخر میں نے روجھان کے تمندار نواب سر بہرام خان کو پیغام بھیجا کہ آپ علاقہ کے رئیس ہیں۔ ایک واقعہ یہاں ایسا ہُوا ہے۔ آپ کے ذرا سے دباؤ سے وہ بیوقوف ہماری بات مان سکتا ہے۔ اگر ایک دفعہ وہ یہاں سے چلا گیا تو عورت بچاری کی ساری قربانی ضائع ہوجائے گی اور بدنام الگ ہوگی''۔ نواب صاحب نے فوراً اُس شخص کو بلا کر ڈانٹا کہ ''تُو بڑا پاجی ہے تُو نے اس عورت کی جان کو خطرہ میں ڈالا اور جب اُس نے تیری بات مان لی تو تو عہد شکنی کرتا ہے۔ جا ابھی اس سے نکاح کر ورنہ تجھے جیل خانہ میں ڈالتا ہوں''۔ نتیجہ یہ ہُوا کہ اُسی دِن



شام سے پہلے اُس عورت کا نکاح مُلّا نے شفا خانہ میں ہی آ کر پڑھا دیا اور دوسرے دِن وہ بمعہ اپنی پہلی بچی کے چھم چھم کرتی اور ہمیں دعائیں دیتی اپنے دولہا کے پیچھے پیچھے گھر کی طرف جا رہی تھی۔ خدا نے جیسے اُس کے دِن پھیرے ویسے ہی سب کے پھیرے۔ آمین

## (15) تعلّی کا حشر

ایک دفعہ مَیں ریل کے سفر میں تھا کہ امرتسر کا اسٹیشن آ گیا۔ اُس درجہ میں کئی شرفا بیٹھے تھے کہ اُن میں سے ایک صاحب خود بخود سب کو مخاطب کر کے اپنی مدح سرائی کرنے لگے کہ ''بھائیو! آج کل سفر میں بہت ہوشیار رہنا چاہیے۔ اسٹیشنوں کے سودے والے مسافروں کو خوب لوٹتے ہیں اور ہم کو بے وقوف بناتے ہیں اس درجہ میں کسی صاحب کو سودا لینا ہو تو میں کھڑکی کے پاس ہوں میری معرفت خریدے''۔

ہم میں سے ایک جنٹلمین اس درجہ کے دروازے سے منہ نکالے باہر دیکھ رہے تھے کہ انہوں نے پلیٹ فارم پر ایک سودا بیچنے والے کو دَونوں میں لوکاٹ رکھے ہوئے بیچتے دیکھا۔ نیا موسمی پھل تھا۔ فوراً آواز دے کر ایک دَونا خریدا اور اندر بیٹھ کر کھانے لگے۔ ساتھ ہی درجہ والوں کے آگے دَونا بڑھا کر انہوں نے کہا کہ ''صاحبان نیا پھل کھائیے''۔ مسافروں نے کہا ''آپ ہی کھائیے۔ ہمارا دِل بھی لوکاٹ نئے کرنے کو چاہتا ہے وہ لوکاٹ والا اب کے پھر ادھر سے گزرے گا تو ہم بھی لیں گے''۔ اتنے میں خود پسند صاحب بولے کہ ''صاحبان آپ نے دیکھا ان کے لوکاٹ کچے اور خراب ہیں۔ جو دَونا چاہا دکاندار نے اُن کے حوالے کر دیا آپ صاحبان مجھے کہیے میں انتخاب کر کے ایسے عمدہ لوکاٹ آپ کو کھلاؤں گا کہ آپ بھی کیا یاد کریں گے۔ میں نے اُس

کی چھابڑی میں اچھے اچھے پھل بھی دیکھے ہیں مگر وہ ہمارے ان دوست کو تو فریب دے کر چلتا ہوا۔ اب ذرا اسے پھر آ لینے دیں''۔

اس پر چند آدمیوں نے کہا کہ ''ہاں! ضرور آپ ہی ہمیں ایک ایک دَونا خرید دیں اور یہ لیں پیسے۔ چنانچہ کئی طرف سے پیسے اُن کی خدمت میں پیش ہوئے۔ فرمانے لگے ''ٹھہر جاؤ! میں سب سے حساب کر کے لے لوں گا۔ فی الحال میں اپنا روپیہ لوکاٹ والے سے بھنا لوں۔ او لوکاٹ والے! ادھر آ ہم کو آٹھ دَونے آٹھ آنہ کے دے دے۔ اور دیکھ (ایک لوکاٹ کی طرف اشارہ کر کے سب لوکاٹ ایسے عمدہ اور نفیس ہوں اوّل درجہ کے ورنہ تیری رپورٹ کر دوں گا''۔

لوکاٹ والے نے اچھا کہہ کر اُن سے روپیہ لے لیا اور کہنے لگا کہ ''مجھے روپے کی ریزگاری بھی کسی سے لینی ہے اور لوکاٹ بھی چھانٹ کر اوّل درجہ کے دینے ہیں۔ یہاں گاڑی کے پاس تو بھیڑ ہے۔ ذرا سامنے نلکا کے پاس بیٹھ کر دَونے نئی طرح کے بنا کر لاتا ہوں۔ اور ریزگاری کا بندوبست بھی کرتا ہوں''۔

غرض سب کی نظر کے سامنے ہی کچھ فاصلہ پر وہ لوکاٹوں کی سارٹ Sort کرنے لگا اور انتظار کرنے لگا کہ کب گارڈ جھنڈی ہلائے۔ گاڑی چھٹنے ہی کو تھی کہ خریدار صاحب نے پھر چیخنا شروع کیا۔ یہاں تک کہ گاڑی حرکت میں آ گئی۔ لوکاٹ والا بھی پیچھے بھاگا۔ اُس کے دونوں ہاتھوں میں آٹھ دَونے اُوپر نیچے رکھے ہوئے تھے جو دوڑ کر اُس نے خریدار کے ہاتھ میں پکڑا دیے اور چلتا ہوا۔ اب یہ صاحب چلّائے ''ارے او اٹھنی تو دے جا۔ او بدمعاش میری اٹھنی جلدی لا اٹھنی''۔ مگر دکاندار نے سنی اَن سنی کر دی۔ آخر شرمندگی اور غصہ کی آمیزش میں فرمانے لگے کہ ''حرامزادے جاتا کہاں ہے مَیں واپسی پر بچہ جی



سے آٹھ آنہ کی جگہ دس آنہ وصول کروں گا''۔ گاڑی کے مسافر ہنس پڑے ایک نے تو کہہ دیا کہ ''وہ تو آپ کا بھی اُستاد نکلا''۔ فرمانے لگے ''میں اس خبیث سے وصول کر کے چھوڑوں گا۔ پیسوں کا فکر نہ کیجئے۔ لوکاٹ کھائیے۔ دیکھئے میں نے کیسا اوّل درجہ کا پھل لے کر دیا ہے۔ ان صاحب کے لوکاٹ تو بالکل تھرڈ کلاس تھے۔ تھرڈ کلاس''۔

یہ کہہ کر اُنہوں نے اپنے دونوں ہاتھ آگے بڑھائے اور کہا ''صاحبان اپنا اپنا دَونا اُٹھا لیجئے''۔ یہ سُن کر اُن کے پاس والے مسافر نے اوپر کا دونا اُٹھالیا۔ جب دوسرے نے ہاتھ بڑھایا تو نمبر دو دونے کو جو پہلے کے نیچے تھا بالکل خالی پایا۔ ''ہیں یہ کیا بدذاتی'' تیسرا بھی خالی سور کا بچہ! چوتھا بھی خالی کتا! پانچواں بھی خالی کنجر! چھٹا بھی خالی بہن کی گالی ساتواں بھی خالی ماں کی گالی! بس صرف اُوپر والا دونا عمدہ لوکاٹوں سے بھرا تھا۔ گاڑی میل بھر نکل چکی تھی۔ پورے سات دونے خالی اور آٹھ آنے کے پیسے الگ ہضم!

آگے میں بیان نہیں کر سکتا۔ آپ خود ہی خیال کر لیں کہ کس قدر اُس شخص کی حالت غصہ اور شرم کے مارے ہوئی ہو گی۔ اور درجہ والوں کا یہ حال کہ ہنس ہنس کر پسلیاں دُکھنے لگیں۔

## (16) تھیئیٹر کا چسکا

میرا لاہور میڈیکل کالج میں آخری سال ڈاکٹری کا تھا میں اور میرا ایک ملازم چراغ نامی چوک متی کے ایک مکان میں رہتے تھے۔ جاڑے کا موسم تھا کہ میرے دو مکرم عزیز اپنے وطن سے لاہور اس نیت سے آئے کہ ایک ہفتہ یہاں رہ کر نیو الفرڈ کمپنی کا تھیئیٹر دیکھیں۔ یہ کمپنی اُن دنوں بمبئی سے لاہور آ کر بہت شہرت پا رہی تھی۔ ہفتہ بھر تک وہ دونوں اور میں روز رات کو نو بجے سے

ایک بجے تک نئے نئے تماشے دیکھتے رہے۔ میرا ملازم چراغ بھی ہمارے ہمراہ ہوتا تھا۔ اسے بھی ہم تماشا میں لے جاتے تھے تاکہ وقت بے وقت کسی ضرورت پر کام آئے۔

جب ہفتہ ختم ہوگیا تو وہ مکرم عزیز واپس گھر کو تشریف لے گئے اُن کا مقصد صرف تھیئٹر کو بغرضِ علم دیکھنا تھا۔ اُنہیں رخصت کر کے دوسرے دِن سے میں بھی اپنی پڑھائی میں مشغول ہوگیا۔ جب رات ہوئی اور آٹھ بجے تو میاں چراغ دوسری منزل پر سے دھم دھم کرتے اُترے میں لیمپ کے آگے پڑھ رہا تھا۔ فرمانے لگے۔

چراغ: ''میاں آج ہریش چندر کا تماشا ہے''۔

میں: ''ہوگا ہم دونوں تو اُسے دیکھ چکے ہیں''۔

چراغ: ''آج سنا ہے کہ نئی وردیاں ایکٹروں کی ہوں گی۔

میں: ''تماشہ تو وہی ہے''۔

چراغ: ''آج شاید آخری دفعہ دکھایا جائے گا''۔

میں: ''آخری دفعہ ہو یا اوّل دفعہ اب ہم بہت تماشے دیکھ چکے ہیں جا اُوپر جا کر سو رہ''۔ یہ سُن کر بچارہ نا امید ہو کر چلا گیا مگر تھوڑی دیر میں بے قرار ہو کر پھر اُترا۔

چراغ: ''میاں لو یہ اشتہار تماشا کا''۔

میں: ''اسے لے کر کیا کروں''؟

چراغ: ''یہ سب تماشوں میں اچھا تماشا ہے اسے ضرور ایک دفعہ اور دیکھنا چاہیے''۔

میں: ''ارے بھئی! ہفتہ بھر تو تماشے دیکھ لئے۔ بڑا وقت ضائع ہُوا ہے۔ اب پڑھنا چاہیے۔ ہمارا آخری سال ہے کالج کا''۔



چراغ: ''آج بجائے زیادہ پیسے خرچ کرنے کے چار آنہ والے درجہ میں ہم دونوں بیٹھ جائیں گے''۔

میں: (سختی سے) ''جا جا کے سو میں ہرگز نہیں جاؤں گا''۔ بچارہ پھر اُوپر چلا گیا۔ مگر پانچ منٹ کے بعد پھر کوٹھے پر سے آگیا۔

چراغ: ''اب تو صرف دس منٹ تماشا میں رہ گئے ہیں''۔

میں: ''پھر میں کیا کروں؟ ارے پاگل! میں ہرگز نہیں جاؤں گا جا اُوپر جا کر سو رہ''۔ چراغ چلا تو گیا۔ مگر راستہ میں سے ہی پھر اُتر کر آ گیا اور بڑے جوش سے کہنے لگا۔

''میاں! اچھا آپ نہیں جاتے تو نہ جائیں۔ اب تو بہت ہی تھوڑا وقت تماشا میں رہ گیا ہے مجھے تو ایک چونی دے دیں۔ میں تو ہو آؤں''۔

یہ سُن کر مجھے اُس پر سخت غصہ آیا اور ہنسی بھی مگر میں نے خفگی کے لہجہ میں اُسے کہا کہ ''فوراً اُوپر چلا جا''۔ اور وہ بیچارہ بھی یہ کہتا ہُوا چلا گیا کہ ''نہ آپ جاتے ہیں نہ مجھے جانے دیتے ہیں''۔

نوٹ: جیسے آج کل سینما کے بغیر لوگ رہ نہیں سکتے اُسی طرح اُس زمانہ میں تھیٹر ہُوا کرتے تھے۔ مگر چونکہ کبھی کبھی آتے تھے۔ اس لئے اس قدر تباہی نہ تھی۔ مگر اس ظالم کھیل کی چاٹ بڑی سخت ہوتی ہے۔ جب میں اوّل اوّل لاہور تعلیم کے لئے اسکول میں داخل ہُوا تو خواجہ کمال الدین صاحب مرحوم کے ہاں رہا کرتا تھا۔ اُن کے والد مجھ سے بڑی محبت کرتے تھے۔ اُن دنوں میری عمر چودہ سال کی تھی۔ ایک دِن فرمانے لگے۔ ''برخوردار! لاہور میں تو آپ آئے ہیں مگر میری ایک نصیحت اپنے پلّے باندھ لیں۔ اور جو جی چاہے کرنا مگر تھیئیٹر نہ دیکھنا ہم کو اس کا تجربہ ہے پہلے تو ہم اپنے پیسے خرچ کرتے رہے۔ پھر والدہ سے مانگ مانگ کر گزارا کیا۔ پھر اُن کی نقدی کی صندوقچیاں

کھولیں۔ آخر میں گھر کے برتن بیچ بیچ کر تماشے دیکھے۔ تم اگر اس میں پڑ گئے تو تباہ ہو جاؤ گے''۔ مجھ پر اُس دِن سے ایسی دہشت تھیٹر کی بیٹھی کہ آج تک اس کا شوق نہیں ہوا۔ ہاں یوں کبھی کبھار بے شک دیکھا ہے:

## (17) واقعی وہ ہوشیار آدمی تھا

کالج کے زمانہ کا واقعہ ہے کہ ایک دفعہ ہم دہلی جا رہے تھے۔ ایک صاحب! امرتسر اسٹیشن پر ہمارے انٹر کے درجہ میں آ بیٹھے۔ جس میں اور بھی کئی لوگ سفر کر رہے تھے بیٹھتے ہی تھوڑی دیر میں وہ سب پر چھا گئے اور اپنی تقریر میں بار بار کہتے تھے کہ ''سفر میں بڑی ہوشیاری اور سمجھ درکار ہے۔ میں نے اپنی ساری عمر پولیس کی ملازمت میں چوکنے رہ کر کاٹی ہے اور کبھی چور یا بدمعاشوں سے چکر نہیں کھایا۔ وجہ یہ ہے کہ آنکھیں اور کان کھول کر رکھتا ہوں۔ اور ہوشیار رہتا ہوں۔ اور ہر مشتبہ مسافر پر نظر رکھتا ہوں''۔

غرض اسی طرح کی لچھے دار تقریریں کرتے جالندھر چھاؤنی کا اسٹیشن آ گیا۔ امرتسر سے جالندھر تک تمام راستہ ان کا خودستائی میں گزرا طرح طرح کی ترکیبیں عقل و فکر کی سنتے سنتے آخر لوگ بھی تنگ آ گئے جالندھر چھاؤنی پر گاڑی کھڑی ہوئی تو کہنے لگے کہ ''مَیں ذرا نیچے اُتر کر پانی پی آؤں'' سب رفیقوں نے کہا کہ ''ضرور'' دو چار مسافروں کے اُترنے کے بعد اُنہوں نے بھی اپنی جگہ سے پیر اُتارے تو دیکھا کہ جوتا غائب! ''بھئی دیکھنا میرا جوتا ابھی تھوڑی دیر ہوئی تو اُتارا تھا۔ بھئی ذرا اپنے اپنے بنچوں کے نیچے تو دیکھنا''۔ غرض ایک غل مچ گیا مگر جوتا نہ ملا سب لوگ بے اختیار ہنسنے لگے۔ کسی نے کہا کہ ''جیسے آپ نامی سراغرساں ہیں ویسا ہی وہ نامی چور بھی ہوگا جو آپ کا جوتا اُتار لے گیا''۔ کسی نے کہا ''یہ آپ کی خودستائی کی سزا ہے اور ماریئے



شیخیاں!''۔ تیسرا بولا ''اجی کچھ مسافر جو اُترے ہیں تو کوئی ننگے پیروں والا پہن کر چلا گیا ہے''۔ غرض جتنے منہ تھے اتنی ہی باتیں۔ ہوتے ہوتے جب مذاق بہت بڑھ گیا تو وہ شخص سیدھا کھڑا ہو گیا اور کہنے لگا۔ ''بھائیو! پہلے میری عقلمندی دیکھ لو، پھر جتنا جی چاہے مذاق اُڑا لینا''۔ یہ کہہ کر اُس نے اُوپر کے تختہ سے اپنا ٹرنک آگے کو کھینچ کر اُسے کھولا اور ایک جوڑا نئی جوتی کا فرش پر رکھ کر اور ہمیں دکھا کر فوراً پہن لیا۔ اور کہنے لگا کہ ''حضرات ہم ہار ماننے والے آدمی نہیں ہیں کوئی چور خواہ کتنا ہی زبردست ہو ہم جیسے پولیس والوں کو نیچا نہیں دکھا سکتا''۔ یہ کہہ کر وہ گاڑی سے اُتر کر پانی پینے چلا گیا اور کہتا گیا کہ ''دیکھ لیا ننگے پیر تو نہیں رہے''۔

## (18) نجومی کی ذِلّت

1917ء کا ذکر ہے کہ میں اپنی دوسری شادی کی تقریب پر دہلی کے کارونیشن ہوٹل میں ٹھہرا ہُوا تھا۔ وہاں میرے کئی بزرگ اور دوست بھی موجود تھے۔ رات کو معلوم ہُوا کہ ہمارے ایک عزیز کے پاس جو نواب کہلاتے تھے دِن کو ایک نجومی اسی ہوٹل میں آیا اور اُن سے ایسی باتیں کر گیا کہ نواب میاں اُن کی غیب دانی کے نہایت درجہ قائل ہو گئے۔ وہ کل پھر آنے کا وعدہ کر گیا ہے۔ میں نے ان نواب صاحب کو کہلا بھیجا کہ ''کل جب وہ آدمی آئے تو مجھے بھی بُلا لیجئے گا''۔ خیر دوسرے دِن گیارہ بجے کے قریب وہ آیا اور ہم سب لوگ جو چوبیس کے قریب تھے ایک کمرے میں جمع ہو گئے۔ نواب صاحب نے میری طرف اشارہ کر کے اُس نجومی سے کہا کہ ''یہ صاحب آپ کی غیب دانی کے قائل نہیں ہیں۔ آپ ان کو اپنا کمال منوا دیں گے تو پھر مَیں بھی آپ سے کچھ ضروری سوالات کروں گا''۔

وہ بڑا چالاک آدمی معلوم ہوتا تھا۔ کہنے لگا ''جو جی آئے پوچھئے مَیں حاضر ہوں''۔ میں نے کہا کہ ''لوگ آپ سے آئندہ کی خبریں ہی پوچھتے ہیں مگر ہمیں خبر نہیں کہ وہ سچ ہوں گی یا جھوٹ میرے نزدیک آپ کے جواب سب غلط ہوتے ہیں اور آپ کے نزدیک سب صحیح۔ اس لئے یہ مناسب ہوگا کہ مَیں بعض گزشتہ باتوں کے متعلق صرف تین سوال آپ سے کروں اگر جواب صحیح ہُوا تو ہم گمان کر سکتے ہیں کہ آئندہ کے متعلق بھی آپ کے جواب صحیح ہوں گے۔ اور میں ایسے موٹے سوال کروں گا جن کے جواب یہ چوبیس دوست جو اس کمرہ میں موجود ہیں سب جانتے ہیں۔ پس آپ اطمینان رکھیں کہ میں جھوٹ موٹ آپ کے جواب کا انکار اتنے گواہوں کے رُوبرو نہیں کرسکوں گا''۔ وہ منجّم بولا۔ ''ہاں یہ اچھا طریقہ امتحان کا ہے۔ آپ اپنے سوال فرمائیے!'' میں نے کہا کہ:

(1) میرا پہلا سوال یہ ہے کہ میرا پیشہ کیا ہے؟

(2) دوسرا یہ کہ میرے والدین زندہ ہیں یا فوت ہوچکے ہیں؟

(3) تیسرے یہ کہ میری کتنی اولاد اس وقت زندہ موجود ہے؟

اس پر اُس شخص نے میری ہتھیلیاں دیکھیں بعض باتوں کے جواب پوچھے۔ سِن اور تاریخ پیدائش دریافت کی۔ اور خدا جانے کیا کیا دیکھا اور پوچھا پھر اپنا حساب اور اندازہ لگا کر ایک فاتحانہ انداز میں کہنے لگا۔ ''لیجئے سُنیئے:

(1) پہلے سوال کا جواب یہ ہے کہ آپ وکیل ہیں:

(2) دوسرے کا یہ کہ آپ کے والدین فوت ہوچکے ہیں۔ (اس پر سب حاضرین نے قہقہہ لگایا۔ میرے والد بزرگوار بھی اسی مجلس میں موجود تھے۔ فرمانے لگے: ''اوخبیث! میں اور اس کی والدہ ہم دونوں زندہ ہیں''۔)

(3) تیسرے سوال کا جواب یہ ہے کہ آپ کے دو لڑکے اور تین لڑکیاں



اس وقت زندہ موجود ہیں۔

میں نے کہا: بھائی صاحب اب میری جرح بھی سُن لیجئے۔ ان تینوں سوالوں کے جواب کو اس مجلس کا ہر فرد ذاتی طور پر جانتا ہے۔ اس لئے غلط بیان نہیں کرسکتا۔

(1) پہلے سوال کا صحیح جواب یہ ہے کہ ''میں وکیل نہیں ڈاکٹر ہوں''۔
کیوں صاحبان! ٹھیک ہے یا غلط؟ سب نے کہا ''ٹھیک ہے''۔

(2) دوسرے کا یہ کہ میرے والد صاحب اور والدہ صاحبہ الحمد للہ دونوں زندہ ہیں۔ اور حضرت والد صاحب تو یہ سامنے تشریف ہی رکھتے ہیں۔ اس کی بھی سب نے تصدیق کی۔

اب غیب داں صاحب کا یہ حال ہُوا کہ کاٹو تو لہو نہیں بدن میں۔ چپکے سے اُٹھ کر سلام کر کے چل دیئے۔ نواب صاحب کہنے لگے۔ ''یہ خبیث کچھ دِل لگتی باتیں سُنا کر کل مجھ سے کچھ روپے ٹھگ کر لے گیا تھا۔ اگر آپ آج یہاں نہ ہوتے تو شاید کوئی بڑی رقم مار لیتا۔ کیونکہ مجھے اس پر بڑا حُسنِ ظن ہو گیا تھا۔ مگر اس وقت ایک سوال کا جواب بھی نہ دے سکا اور نِرا جھوٹ کا پتلا نکلا کم بخت! بے ایمان!''

## (19) جھوٹا شیخی باز

کالج کی تعلیم کے زمانہ میں ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ میں ریل میں سفر کر رہا تھا۔ گاڑی میں ایک صاحب سفید پوش پیر مرد کوئی پچپن یا ساٹھ سال عمر کے، معقول صورت آ کر بیٹھ گئے اور آتے ہی کہنے لگے۔ ''صاحبان میں فلاں محکمہ کا انسپکٹر پنشنر ہوں۔ بڑی دُنیا دیکھی۔ بڑا تجربہ حاصل کیا۔ بُرا بھلا سارا زمانہ دیکھا سرد گرم چشیدہ ہو کر پنشن لی۔ اب یادِ خدا کرتا ہوں اور دِن رات

مخلوق کی خیر خواہی کے سوا اور کوئی کام نہیں ہمارے تجربہ میں دیانت اور ایمانداری سے بڑھ کر کوئی چیز نہیں آئی''۔

غرض تھوڑی دیر میں انہوں نے مسافروں پر اپنا سِکّہ جما لیا۔ اتفاق ایسا ہُوا کہ ڈاک گاڑی ایک گھنٹہ کے بعد کسی ٹکٹ چیکنگ اسٹیشن پر ٹھہری اور چیکر بلائے بے درماں کی طرح ہمارے خانہ میں آ گھسا۔ سب کے ٹکٹ دیکھے، انٹر کلاس کے تھے۔ اُن صاحب کو جو دیکھا تو تھرڈ کا۔ ہمراہی سب حیران ہو کر ہنسنے لگے کہ ابھی تو اپنی ساری عمر کا تجربہ، دیانت اور ایمانداری کو بتا رہے تھے اور اب سارے خانہ میں یہی بددیانت اور بے ایمان ثابت ہو رہے ہیں۔ واہ ری دُنیا! اور واہ رے اس کے جُھوٹ!!؎

جہاندیدہ بسیار گوید دروغ

ٹکٹ کلکٹر نے اُن سے پوچھا کہ ''آپ کا ٹکٹ تو تھرڈ کا ہے اور بیٹھے ہیں انٹر میں؟'' فرمانے لگے۔ ''بھائی! ہم اَن پڑھ انگریزی سے ناواقف دیہاتی لوگ بھلا کیا جانیں کہ انٹر کیا بلا ہوتا ہے۔ اور تھرڈ کیا۔ مَیں تو سمجھا نہیں' آپ ہی سمجھا دیجئے''۔ اس پر اور قہقہہ پڑا۔ پھر کہنے لگے۔ ''مَیں نے ٹکٹ کے پیسے کسی اپنے عزیز کو دیے تھے وہ یہاں بٹھا گیا ہے۔ مَیں کیا جانوں مجھے کہاں بیٹھنا چاہئے''۔ ٹِکٹ بابو کو کچھ شرم آ گئی۔ اُس نے کہا کہ ''اس گاڑی سے اُترو اور دوسرے خانہ میں جا کر بیٹھو''۔ فرمانے لگے۔ ''تو پھر آپ کو مجھے جہاں بٹھانا ہے بٹھا دیجئے مَیں تو کچھ جانتا نہیں''۔ بابو اُن کو ہاتھ پکڑ کر لے چلا۔ تو کہنے لگے۔ ''اور میرا اسباب؟'' غرض بچارے بابو نے قُلی کو بُلا کر اُس پر اُن کا اسباب لادا' اور کہا کہ ''جا ان کو تھرڈ کے خانہ میں بٹھا دے''۔ کہنے لگے ''بابو جی مجھ غریب کے پاس تو قُلی کو دینے کے لئے پیسے بھی نہیں ہیں۔ سرکار ہی مجھے چڑھائے گی۔ تو کام بنے گا''۔ اُن کا اسباب قُلی کے سر پر تھا۔ تھرڈ کا



خانہ نزدیک اور ریل چلنے کو تیار غرض وہ اور اُن کا سامان دونوں چڑھ گئے مگر اُنہوں نے بھی قلی کو ایک پیسہ نہ دیا۔ اور یہی کہتے رہے کہ ''بابو کے حکم سے تم اسباب لائے ہو اُن سے پوچھو۔ میں غریب بچارہ تم کو کیوں کر پیسے دوں''۔

غرض قلی بھی روتا پیٹتا چلا گیا۔ اور ہمارے درجہ والوں نے پھر جو اُن کی نقلیں کرنی شروع کیں۔ تو کئی اسٹیشن تک اُنہی کا ذکر خیر جاری رہا۔

## (20) اولاد کی خواہش

سرسہ ضلع حصار کا 1915ء کا ذکر ہے کہ ایک دِن ایک معزز گھرانے کی دو خاتونیں بہت بُری طرح پٹی ہوئی میرے ملاحظہ اور علاج کے لئے لائی گئیں۔ کئی ہڈیاں اُن کی شکستہ تھیں اور ایک کے سر پر تو لاٹھیوں کے پانچ چھ بڑے بڑے زخم بھی تھے اور دونوں کے بدن ڈنڈے کی مار سے نیلے ہو رہے تھے۔ خیر میں نے ان کو دیکھا۔ پولیس کو رپورٹ بھیجی ڈریسنگ وغیرہ کیا اور بہت دنوں تک جب تک وہ اچھی نہ ہوئیں اُن کا علاج کرتا رہا۔ اب سارا واقعہ اُن کی مصیبت کا مختصر طور پر لکھتا ہوں۔

یہ دونوں عورتیں برہمن اور آپس میں نند بھاوج تھیں۔ نند بیوہ تھی فرض کرو اُس کا نام شانتی تھا۔ اور بھاوج سہاگن تھی مگر بے اولاد فرض کرو اس کا نام لاجونتی تھا۔ شہر میں ایک رئیس کا بیٹا ایک سال کی عمر کا اتفاقاً فوت ہو گیا۔ اُس دِن دیوالی تھی۔ ہندوؤں میں بڑی عمر کے لوگ مرنے پر جلائے جاتے ہیں مگر بچے اور سادھو دفن کئے جاتے ہیں۔

چنانچہ اُس لڑکے کو بھی شہر سے ایک میل کے فاصلہ پر ہندوؤں کی شمشان بھومی میں دفن کر دیا گیا۔ ساتھ ہی کسی نے اُس رئیس سے یہ بھی کہلایا کہ ''لالہ جی آج ہندوؤں کا بڑا تہوار ہے ایسے موقع جادو ٹونے وغیرہ کے

لئے موزوں ہوتے ہیں آپ احتیاطاً بچے کی قبر پر دو مضبوط آدمیوں کا پہرہ بٹھا دیں۔ تاکہ کوئی اس کی نعش کو خراب نہ کر سکے‘‘۔ چنانچہ لالہ جی نے گھر جا کر دو مسلمانوں کو اس کام کے لئے بھیج دیا کہ رات بھر مرگھٹ میں پہرہ دیں۔ اُس دِن آندھی اور تاریکی بھی بہت تھی۔ وہ پہرے دار قبر سے کسی قدر فاصلہ پر بیٹھ گئے اور موٹی موٹی لاٹھیاں اپنے پاس رکھ لیں۔ خدا کا کرنا کیا ہُوا کہ کسی بڑھیا عورت نے نند بھاوج سے جا کر کہا کہ ’’آج تہوار کا دِن ہے اور ایک لڑکا فلانے لالہ کا مر کر یہاں کے مرگھٹ میں دفن کیا گیا ہے۔ اگر لاجونتی اولاد چاہتی ہے تو آج موقع ہے تم دونوں مرگھٹ میں جا کر اور قبر اُکھیڑ کر اُس بچہ کو نکالو۔ پھر لاجونتی بچہ کے منہ میں اپنا پستان بطور دودھ پلانے کے دے اور اتنی دیر یہ منتر پڑھتی رہے۔ پھر بچہ کو زمین پر لٹا کر اُس کی چھاتی پر بیٹھ کر خود اشنان کرے۔ بعد ازاں اُسے وہیں دفن کر کے چلی آوے۔ یہ نسخہ اولاد ہونے کے لئے بے خطا ہے۔ ایک سال کے اندر اندر اُس کے ہاں بالک ضرور پیدا ہوجائے گا‘‘۔ یہ ترکیب اُس غریب عورت سے سُن کر وہ دونوں فوراً تیار ہو گئیں کہ اس پر عمل کریں۔ شانتی تو بیوہ تھی وہ ہمراہی کے طور پر اور لاجونتی اولاد کی امید وار کے طور پر رات کو دس بجے مرگھٹ کی طرف اُسی عورت کے ہمراہ روانہ ہوئیں اور ایک بالٹی پانی کی اُسے اُٹھوا دی تاکہ اشنان کیا جا سکے۔ رات کو گیارہ بجے کے قریب اُن دو پہریداروں نے ان تینوں عورتوں کو آتے دیکھ لیا۔ ایک مدھم سی لالٹین عورتوں کے پاس تھی۔ اُس بڑھیا نے بچہ کی قبر اُن کو دِکھا دی اور خود کوئی سو گز پیچھے ہٹ کر آ بیٹھی۔ شانتی اور لاجونتی نے قبر کی مٹی ہٹا کر اس مُردہ بچے کو نکالا پہلے اُس کی چھاتی پر بیٹھ کر لاجونتی نے اشنان کیا۔ پھر اُسے گود میں لے کر اپنی چھاتی اُس کے منہ میں دے کر بیٹھ گئی۔ اتنے میں وہ پہریدار جو پہلے ایک طرف ڈر کر چھپ گئے تھے۔ سارے معاملہ کو سمجھ



گئے اور لٹھ لئے دبے پاؤں پیچھے سے ان عورتوں کے سر پر پہنچ گئے۔

ہمراہی عورت نے جو فاصلہ پر بیٹھی تھی اُن کو مع ان کی لاٹھیوں کے دیکھ لیا اور سرپٹ شہر کو بھاگی اُدھر ان پہرہ داروں نے یک دم دونوں عورتوں کے سر پر اپنے ڈنڈے برسانے شروع کر دیے اور مار مار کر بُھرکس نکال دیا۔ حتیٰ کہ وہ بے ہوش ہوگئیں۔ پھر یہ خیال کر کے کہ کہیں کسی مقدمہ میں نہ پکڑے جائیں وہاں سے بھاگ گئے۔ ان عورتوں کی رفیقہ نے جو قبرستان سے بھاگی تھی اور انہیں مار کھاتے بھی دیکھ لیا تھا۔ سیدھا شہر میں آ کر دَم لیا اور گھر والوں سے کہا کہ شانتی اور لاجونتی ماری گئیں۔ پھر اُن کا سب حال مفصل سُنایا۔ اس پر اُن عورتوں کے گھر والے مرد لاٹھیاں لے کر مرگھٹ کی جانب دوڑے گئے اور لالٹینوں کی روشنی میں دیکھا کہ دونوں عورتیں بے ہوش پڑی ہیں۔ لاجونتی تو بالکل برہنہ ہے کیونکہ اشنان کر کے مُردہ بچے کو دُودھ پلا رہی تھی اور شانتی کے بدن پر کپڑے موجود ہیں اور بچہ بھی وہیں قبر سے باہر پڑا ہے۔ اتنے میں اُن پہریداروں نے جو بھاگ گئے تھے لالہ جی سے جو متوفی بچہ کے باپ تھے اسی وقت آدھی رات کو جا کر سارا معاملہ عرض کر دیا۔ وہاں سے لالہ جی نوکروں کا ایک لشکر اور کچھ لالٹینیں لے کر مسان آ پہنچے۔ آگے دیکھا تو ایک پارٹی برہمنوں کی پہلے سے موجود تھی وہاں جا کر ساری حقیقت کھلی۔

پہلے تو فریقین میں خوب تُو تُو مَیں مَیں ہوئی پھر یہ دیکھ کر کہ دونوں خاندان شہر کے رئیس اور معزز لوگ ہیں۔ اور اصلی غلطی اور جرم اُن طالبِ اولاد عورتوں کا ہی ہے۔ آخر میں یہ فیصلہ کیا گیا کہ چلو جو ہُوا سو ہوا۔ اب اس معاملہ کو طول نہ دیا جاوے۔ بلکہ بڑے لوگوں کی عزّت کی خاطر دبا دیا جاوے چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ اگرچہ شانتی ایک ماہ اور لاجونتی تین ماہ تک بستر پر پڑی اپنے زخموں پر پٹیاں لگواتی رہیں۔

# (21) کالی

پنجاب کی مغربی سرحد پر بلوچوں کی کئی تُمنداریاں یعنی جاگیریں قائم ہیں۔ وہاں کے رسم ورواج عجیب ہیں۔ ایک دفعہ مجسٹریٹ علاقہ نے مجھے لکھا کہ ''مہربانی کر کے فلاں جگہ جائیں اور ایک قبر کھود کر مُردہ کی نعش نکال کر پوسٹ مارٹم کریں۔ کیونکہ ایک عورت ''کالی'' ہوگئی تھی اور یہ مخبری ہوئی ہے کہ وہ اس قبر میں دفن ہے''۔ میں سب انسپکٹر پولیس کی ہمراہی میں اُس مقام پر پہنچا وہاں ایک شخص نے نشان دہی کی کہ ''یہ قبر ہے'' خیر اُسے کھدوایا گیا تو بجائے کفن پوش مُردہ کے اس میں سے ایک نوجوان عورت کی نعش نکلی جو لباسِ عروسی سے آراستہ تھی۔ یعنی ریشمی رنگین شلوار۔ گوٹہ طلاّ لگا ہُوا کُرتہ اور سرخ دوپٹہ، بال گندھے ہوئے تھے اور خوب کنگھی چوٹی اور زینت کی ہوئی تھی مَیں نے نعش نکلوا کر اُس کا پوسٹ مارٹم کیا تو معلوم ہُوا کہ وہ پھانسی لے کر مری ہے۔ اور اسی طرح بغیر غسل کے انہی کپڑوں میں دفن کر دی گئی ہے۔ نعش دیکھتے ہی وہاں کے لوگ بول اُٹھے کہ ''کالی ہے'' ''کالی ہے''۔

اپنا کام ختم کر کے میں نے سب انسپکٹر سے پوچھا کہ ''کالی کا کیا مطلب ہے اور یہ عورت غسل اور کفن کے بغیر اپنے بہترین کپڑوں میں کیوں ملبوس ہے''؟ اس پر اُنہوں نے ایک بلوچی رسم کا ذکر یوں سنایا۔

''ہر ملک اور ہر قوم میں نیک چلن عورتیں بھی ہوتی ہیں اور بد چلن بھی۔ اس علاقہ میں اگر کوئی عورت مخفی طور پر بدچلن ہو جائے تو اُسے نہ کوئی بُرا کہتا ہے نہ اُس پر کوئی گرفت کی جاتی ہے اور مدتیں اسی طرح گزر جاتی ہیں آخر اتفاقاً کسی دِن اس خاندان کی کسی عورت کی کسی دوسرے خاندان کی عورت سے تکرار یا لڑائی ہوجاتی ہے تو دشمن عورت پکار کر سب گاؤں والوں



کے سامنے یہ کہہ دیتی ہے کہ ''لوگو! یہ عورت کالی ہے (یعنی بدکار ہے) اور فلاں شخص اس سے ناجائز تعلق رکھتا ہے''۔ اسی وقت سے سارے علاقہ میں یہ خبر آگ کی طرح پھیل جاتی ہے کہ فلاں عورت کالی ہوگئی ہے یعنی لوگوں کی زبان پر اُس کی بدچلنی مشہور ہوگئی ہے۔ اس اعلان کے بعد اس کالی عورت کے باپ یا بھائی کا (نہ کہ خاوند کا) یہ فرض ہوجاتا ہے کہ اُسے اپنے ہاتھ سے قتل کر دیں دوسرا کوئی یہ کام کرنے کا مجاز نہیں۔ پھر وہ اُسے جنگل میں لے جا کر تلوار سے قتل کر دیتے ہیں۔ مگر چونکہ یہ فعل زیادہ مکروہ اور بے رحمانہ ہوتا تھا اس لئے عموماً ایسی عورتیں اب یوں کرتی ہیں کہ نہا دھو کر اپنے بہترین کپڑے پہن کر جنگل میں خود ہی کسی درخت پر چڑھ کر گلے میں رسّہ ڈال کر خودکشی کر لیتی ہیں۔ پھر باپ یا بھائی اُس کی نعش اُتار کر بغیر غسل و کفن کے اُنہی کپڑوں میں اُسے دفن کر دیتے ہیں۔ اپنے اس فعل سے گویا وہ عورت اقراری مجرم کی طرح اپنے گناہ کی تصدیق کر دیتی ہے۔ اس کے بعد اُس کے باپ یا بھائیوں کا یہ بھی فرض ہے کہ اُس شخص کا پیچھا کریں جس سے اُسے مُتہم کیا گیا تھا۔ اور عموماً وہ اُسے بھی قتل کر ڈالتے ہیں۔ شاذونادر وہ شخص علاقہ چھوڑ کر غیر علاقہ میں بھاگ بھی جایا کرتا ہے ایسا آدمی اگر دس سال کے بعد واپس آئے تو پھر اُس کا پیچھا نہیں کیا جاتا ورنہ اس سے پہلے جب بھی ملے تو لڑکی والوں کا فرض ہے کہ اُسے مارڈالیں ایک دفعہ اسی طرح ایک اور مقدمہ میں جب عورت کو قتل کر کے اُس کے بھائی نے عورت کے یار کو ایک کھیت میں جا لیا اور قتل کرنا چاہا تو اُس یار نے اُس بھائی کا مقابلہ کیا اور عورت کا بھائی مارا گیا۔ دُنیا کا عام قانون تو یہ ہے کہ اپنے بچاؤ اور ڈیفنس میں جو شخص قاتل کو مار دے اُس پر کوئی گناہ نہیں مگر بلوچی جرگہ کا یہ قانون ہے کہ ایسا نالائق شخص جس نے حفاظتِ خود اختیاری میں اپنی جان کو بچایا تھا اور حملہ آور

کو قتل کر دیا تھا سات یا دس سال کے لئے مع اپنے کنبہ اور عزیزوں کے ملک بدر کیا جاوے۔ یہ اُس کی نالائقی ہے کہ وہ چونکہ زنا کار تھا اور عورت زنا کی سزا میں قتل ہو چکی تھی پھر اُس نے اپنے تئیں کیوں نہ قتل ہونے دیا۔ بلکہ اُلٹا قاتل کو قتل کر دیا۔ اس واسطے اس کے لئے ضبطیٔ جائداد کے علاوہ چند سال کی جلا وطنی بھی ضروری ہے۔ اور جرگوں کے مقدمات میں اسی قسم کے فیصلے کوئٹہ اور فورٹ منرو وغیرہ میں ہوتے رہتے ہیں۔ گویا پرانی مشہور سنگساری والی سزا کے بدلہ وہ ''کالی'' عورت تلوار سے قتل کی جاتی ہے یا کہہ دیتی ہے کہ مجھے قتل نہ کرو میں خود ہی پھانسی لے لیتی ہوں۔ اور فریق ثانی جو مرد ہوتا ہے اس کے لئے بھی مناسب ہے کہ جب عورت کا بھائی یا باپ اُسے قتل کرنے آوے تو ان کو اپنے فعل کے کرنے میں سہولیت بہم پہنچاوے بغیر کالی ہونے کے اعلان کے یعنی کسی مخالف یا دشمن کے کہہ دینے کہ فلاں عورت فلاں مرد سے کالی ہے۔ خواہ وہ ساری عمر اپنا منہ کالا کراتی رہے اُس پر کوئی گرفت نہیں ہے یا کالی نامراد ہو کر اگر ایسی عورت اپنی قوم کے تمندار کے دارالخلافہ میں بھاگ کر آجاوے تب بھی اُسے امن مل جاتا ہے اور وہاں پھر اُسے کوئی قتل نہیں کر سکتا۔ گویا وہ حرم میں آ گئی لیکن ایسا بہت شاذ ہوتا ہے۔

## (22) نیچ اقوام کی ذِلّت

جنوبی پنجاب کے ہندو جاٹوں کے دیہات میں ہندو تو مرنے کے بعد جلائے جاتے ہیں اور مسلمان دفن کئے جاتے ہیں۔ مگر چمار وغیرہ نیچ اقوام کے ساتھ ایک عجیب سلوک کیا جاتا ہے جونہی کوئی چمار مرجاتا ہے اور اُسے دفن کرنے کے لئے اس کے وارث قبر کھودتے ہیں تو ضروری ہے کہ ایک دو معتبر جاٹ وہاں کے باشندے اس قبر کے پاس موجود رہیں۔ پھر اس چمار کی نعش کو



منہ کے بل اوندھا قبر میں لٹا کر دفن کر دیتے ہیں بظاہر تو یہ کہتے ہیں کہ: ''چمار کی رُوح کہیں بھوت بن کر پھر گاؤں میں واپس نہ آجائے۔ اس لئے ہم اُسے اوندھا دفن کراتے ہیں'' مگر دراصل یہ بھی نیچ اقوام کے ذلیل رکھنے کی ایک ترکیب ہے۔ اور وہ جاٹ اس لئے وہاں دفن کرتے وقت کھڑے رہتے ہیں کہ کہیں چمار اپنے مُردہ کو سیدھا دفن نہ کر دیں۔

## (23) فقیر کا اندوختہ

ایک فقیر سونی پت کے ریلوے اسٹیشن پر بھیک مانگا کرتا تھا۔ ایک دن وہ تھرڈ کلاس ویٹنگ روم میں مرا ہُوا پایا گیا۔ پولیس اُس کی نعش کا ملاحظہ کرانے کے لئے میرے پاس لے آئی۔ بچارہ بڈھا اور مریض سا آدمی تھا۔ قدرتی اسباب سے مر گیا تھا۔ مگر چونکہ اسٹیشن پر مرا ہُوا پایا گیا اس لئے تفتیش ہونی ضروری تھی۔ میں جب لاش خانہ میں گیا تو پوچھا کہ ''اس کے کپڑوں یا جیبوں میں تمباکو یا اور کوئی چیز پائی گئی ہے؟'' پولیس والے سپاہی نے کہا کہ ''سوائے اس دھوتی اور کرتہ کے اس کے جسم پر کوئی کپڑا نہ تھا۔ نہ اور کوئی چیز''۔ خیر یہ کپڑے بھی اُتار دیے گئے اور نعش چیرنے والا ڈسپنسر چاقو لے کر نعش کاٹنے لگا۔ اتنے میں مَیں نے دیکھا کہ مُردے کی پنڈلی پر ایک پٹی بندھی ہوئی ہے خیال ہُوا کہ کوئی پرانا زخم ہوگا۔ شاید اس سے کوئی وجہ موت کی معلوم ہو جائے۔ میں نے مہتر کو کہا کہ ''پٹی اُتار دے''۔ کھولتے کھولتے یکدم میز پر کھنا کھن آٹھ روپے گر پڑے۔ زخم قطعاً کوئی نہ تھا۔ معلوم ہُوا کہ اس غریب فقیر کی یہی کمائی تھی۔ اور اس کی حفاظت کی صورت اس نے یہی نکالی تھی کہ پنڈلی کے گرد پٹی کے اندر اپنا اثاثہ رکھ کر باندھ لے تاکہ لوگ اسے زخم سمجھیں اور کوئی اس کی جمع پونجی کو چرانہ لے۔ بعد میں پوسٹ مارٹم کرنے

سے معلوم ہُوا کہ وہ فقیر مرضِ سل و دِق سے فوت ہُوا تھا۔

## (24) صدموں سے آدمی پاگل ہوجاتا ہے

ایک بُڈھا آدمی ایک دِن مجھ سے آنکھیں بنوانے آیا۔ اس کی دونوں آنکھیں موتیا بند سے نابینا ہوچکی تھیں۔ وہ اکیلا بھی تھا۔ میں نے اُس کی دونوں آنکھیں بیک وقت بنا دیں۔ اور پٹی باندھ کر چارپائی پر لٹا دیا۔ ساتھ ہی شفاخانہ کے عملہ والوں سے کہدیا کہ ''یہ شخص بغیر ساتھی کے ہے اس کو کسی طرح کی تکلیف نہ ہونے پائے۔ بار بار پوچھتے اور دیکھتے رہنا''۔

شفا خانہ کا کام ختم کر کے گھر آ گیا۔ ایک گھنٹہ کے بعد عملہ کا ایک آدمی بھاگا ہُوا آیا ''وہ آنکھوں والا اپنی پٹی کھول کر چارپائی پر پھینک گیا ہے اور خود غائب ہے'' یہ خبر پا کر مَیں باہر نکلا اور لوگوں کو جمع کر کے مختلف راستوں پر بھیجا کہ اُسے تلاش کر لائیں۔ دو گھنٹہ کے بعد وہ پکڑا ہُوا آیا۔ وہ لوگ جو اُسے پکڑنے کے لئے مَیں نے بھیجے تھے کہنے لگے کہ ''ہم نے یہاں سے تین میل پر اُسے جا پکڑا ہے۔ یہ اپنی لاٹھی لئے آنکھیں کھولے اپنے گاؤں کی طرف چلا جا رہا تھا''۔ میں نے اُس سے پوچھا کہ ''بابا تُو نے یہ کیا غضب کیا؟'' کہنے لگا۔ ''مجھے خبر نہ تھی کہ تُو مجھے پٹی باندھ کر یوں چارپائی پر قید کر دے گا؟ ڈاکٹر مجھے تو خفقان ہے، میں تو نیم دیوانہ ہوں، مجھے تو صدموں نے ہلاک کر دیا ہے۔ میرے سات جوان بلند و بالا خوبصورت بیٹے تھے اور ساتوں کے ساتوں گزشتہ سال کی ہیضہ کی وباء میں ایک ہی دِن میں مرگئے۔ اب میں بے اولاد ہوں اور بے عقل، خفقانی ہوں اور پاگل۔ مَیں بھلا کہاں آنکھوں پر پٹی بندھوا کر ہفتہ عشرہ تک چارپائی پر قید رہ سکتا ہوں''۔ مَیں نے اُسے تسلی دی اور مسکّن دوا بھی پلائی۔ پھر پٹی اُس طرح باندھ دی اور آٹھ روز دِن رات برابر اُس پر پہرہ



رکھا۔ آٹھویں دِن جب پٹی کھولی تو دونوں آنکھیں تارا سی روشن تھیں۔ اور آنکھیں بنواتے ہی دُھوپ میں تین میل جانے سے اور تین میل آنے سے اُسے کوئی بھی نقصان نہیں پہنچا تھا۔

## (25) جِنّات کا کرشمہ!

میں سرسہ ضلع حصار میں تھا۔ یہ غالباً 1914ء کا واقعہ ہے۔ ایک دِن ایک پولیس کانسٹیبل ایک عورت کو ڈاکٹری ملاحظہ کے لئے لایا۔ میں نے پولیس رپورٹ پڑھی تو اُس میں لکھا تھا کہ ''مسمّی فتح محمد موضع فلاں نے پولیس میں رپورٹ کی کہ ''میرے موضع کے ایک شخص مسمّی جھنڈو نے جو میرا مخالف ہے میری بیٹی مسمات نوری عمر بیس سال پر جو ابھی ناکتخدا ہے کوئی عمل جِنّ بُھوت وغیرہ کا کرایا ہے اور ایک منصوری پیسہ پڑھوا کر میری لڑکی کی طرف بذریعہ مؤکّل بھیجا ہے جو نہایت زور سے لڑکی کی پیشانی پر لگا اور اس کے بعد وہ جِنّ لڑکی پر سوار ہوگیا۔ اب لڑکی پر بے ہوشی کے دورے پڑتے ہیں اور وہ کہتی ہے کہ مجھ پر ماموں مولا بخش سوار ہیں۔ ہم نے بہت سے عامل بلائے مگر کوئی اس مولا بخش کو نہ اُتار سکا اب عرض یہ ہے کہ لڑکی کا ملاحظہ ڈاکٹری کرایا جائے اور جھنڈو کو قرار واقعی سزا دی جائے یا اس کی ضمانت لی جاوے کیونکہ معاملہ قابلِ دست اندازئ پولیس ہے''۔ آخر میں لکھا تھا کہ ''لڑکی کو اس کے والد کے ہمراہ برائے ملاحظہ طبّی بھیجا جاتا ہے''۔ مطلع فرماویں کہ ''اس پر جن چڑھا ہُوا ہے یا نہیں؟ اور خفیف ہے یا شدید؟''

میں نے جب یہ پڑھا تو پولیس کی رپورٹ لکھنے والے کی عقل پر سخت حیران ہوا۔ سپاہی سے پوچھا کہ ''جب یہ مارکٹائی کا معاملہ نہیں ہے تو مَیں ضربات کیا لکھوں؟ میرے محکمہ کو جنّات سے کیا واسطہ! وہ احمق کہنے لگا کہ

''جناب! لڑکی اپنے ماتھے پر عمل کا پیسہ لگنا بیان کرتی ہے۔ یہ تو صاف ضرب کی قسم ہے۔ اس کے بعد سے وہ بے ہوش ہے۔ اور اس کے سر پر جن بولتا ہے۔ یہ اس ضرب کا ہی اثر ہے۔ آپ جیسا مناسب سمجھیں لکھ دیں''۔ مجھے فتح محمد مدعی سے بہت زیادہ خود پولیس والوں پر تعجب تھا مگر چونکہ جنّات کا معاملہ تھا اس لئے میں اُٹھ کر باہر نکلا۔ دیکھتا کیا ہوں کہ دس بارہ آدمی سڑک پر ایک چھکڑا لئے کھڑے ہیں اور اس میں ایک جوان مضبوط مسٹنڈی عورت لیٹی ہوئی ہے جس کی آنکھوں سے وحشت برس رہی ہے۔ بہتیرا اُس سے پوچھا گچھا مگر وہ کچھ نہ بولی۔ آخر مَیں نے اُس کے رشتہ داروں سے کہا کہ ''اسے چھکڑے پر سے اُتار کر اندر آپریشن والے کمرے میں لے چلو''۔ چنانچہ دو آدمیوں نے اُس کا سر پکڑا دو نے پیر درمیان میں کسی نے سہارا بالکل نہیں دیا۔ مگر وہ لڑکی ایسی سیدھی اور اکڑی رہی گویا لکڑی کا ایک تختہ ہے۔

غرض ان آدمیوں نے لکڑی کے کُندے کی طرح اُسے اُٹھایا کمرے میں لے جا کر آپریشن کی میز پر لٹا دیا۔ میں نے جب لڑکی کو دیکھا تو پتا لگ گیا کہ کس قسم کا جن ہے۔ اس کے ساتھی مرد مضبوط اور تندرست زمیندار جاٹ تھے۔ مَیں نے اُن میں سے چھ کو انتخاب کر کے باقیوں کو کمرہ سے باہر بھیج دیا اور یہ کہا کہ ''اب مَیں اُس جن کو بُلانے لگا ہوں تم پوری قوّت کے ساتھ میری مدد کرنا اور اسے ہلنے نہ دینا''۔ چنانچہ ایک آدمی نے ایک ہاتھ لڑکی کا پکڑ لیا دوسرے نے دوسرا۔ دو نے ٹانگیں اور باقی نے باقی حصّہ جسم کا میز پر اپنی پوری قوّت سے دبا لیا تا کہ وہ ذرّہ بھی حرکت نہ کر سکے۔ اور انہیں سمجھا دیا کہ ''خواہ یہ عورت کتنا ہی تڑپے تم اسے ہلنے نہ دینا۔ ورنہ خطرہ ہے کہ جن اِسے چھوڑ کر تم پر چڑھ جائے گا''۔ غرض اس طرح اُس کو چومیخا کر کے میں نے پہلے تو اُس لڑکی کے ساتھ زور زور سے باتیں کرنی شروع کیں کہ ''تُو کون ہے؟ اور کیوں



اس لڑکی کے سر پر چڑھا ہے؟ مگر اس لڑکی نے کسی بات کا جواب نہیں دیا۔ آخر تنگ آ کر میں نے ایک بڑی بوتل چوڑے منہ کی لے کر اُس میں ایمونیا کارب AM. Carb بھرا اور بوتل کا منہ اُس کی ناک پر لگا کر سر کو اس طرح پکڑ لیا کہ وہ حرکت نہ کر سکے۔ لڑکی نے شروع میں تو بڑی ہمّت دِکھائی اور کچھ نہ بولی مگر آخر تا بکے۔ پہلے تو ناک سے پھر آنکھوں اور منہ سے بھی پانی جاری ہو گیا۔ مجبور ہو کر چیخنے لگی کہ ''چھوڑ دو چھوڑ دو'' میں نے کہا ''نہیں پہلے یہ بتا کہ تُو کون ہے؟ اور کس لئے اس لڑکی کے سر پر چڑھا ہے؟'' وہ کہنے لگا کہ ''مَیں جن ہوں اور مسمّی جھنڈو نے عمل کرا کے ایک منصوری پیسے کو پڑھ کر مجھے اُڑایا ہے۔ اس عمل کے زور سے وہ پیسہ اس لڑکی کے ماتھے پر آ لگا اور مَیں اس کے سر پر چڑھ گیا۔ اب مَیں اسے چھوڑ نہیں سکتا چاہے تم کچھ بھی کرو''۔ مَیں نے کہا۔ ''بھائی! اس غریب لڑکی کو پکڑنے سے کیا فائدہ؟ تم کسی زبردست سے جا کر زور آزمائی کرو''۔ کہنے لگا ''تُو زور لگا لے''۔ میں نے ایک تولیہ لے کر دوا کی بوتل کے منہ کے چاروں طرف اس طرح لگا دیا کہ ناک اور منہ میں تازہ ہوا بالکل نہ جا سکے۔ اس طرح جب دوا پوری تیزی سے اُس کے دماغ میں گھسی تو وہ عورت بے قرار ہو کر چیخنے لگی۔ میں نے کہا۔ ''یہ ہماری تمہاری زور آزمائی ہے یا تو اسے چھوڑ کر چلتے بنو نہیں تو مَیں تم کو زندہ نہیں چھوڑوں گا''۔ کچھ لمحہ صبر کر کے پھر وہ عورت چلائی کہ ''اچھا اب مَیں جاتا ہوں''۔ پھر خاموش ہو گئی۔ مَیں نے آواز دی۔ ''نوری نوری نوری''، تو اُس نے کوئی جواب نہ دیا اُدھر اُس کے پکڑنے والوں نے غلطی سے سمجھ لیا کہ جن اُتر گیا ہے۔ اُنہوں نے اپنی گرفت ڈھیلی کر دی۔ گرفت نرم کرنے کی دیر تھی کہ وہ تو سانپ کی طرح بل کھا کر ان چھ آدمیوں کے ہاتھوں میں سے نکل اُٹھ بیٹھی اور کہنے لگی ''مجھے کون نکال سکتا ہے؟ ہٹ جاؤ۔ دُور ہو جاؤ گردن مروڑ دوں گا''۔ غرض ایک

دفعہ آزاد ہو کر اُس نے ان سب لوگوں کو نئے سرے سے مرعوب کر لیا اور ہمارا عمل سب بیکار ہو گیا۔ مگر میں نے اُن سے کہا کہ ''جلدی اسے قابو کرو اب یہ جن نکلنے پر آیا ہے۔ اس وقت ذرا بھی غفلت کی تو میری اور تمہاری دونوں کی خیر نہیں''۔ غرض بہ ہزار دِقّت انہوں نے اُسے پھر پکڑ کر گرایا اور پوری قوت کے ساتھ اس طرح میز پر دبایا کہ ہلنے کی گنجائش نہ چھوڑی۔ مَیں نے پھر اپنا عمل شروع کیا۔ اور اب کی دفعہ ہوا کو چاروں طرف سے بند کر کے بوتل کو ہلا کر اس طرح اُسے منہ اور ناک پر فٹ کر دیا کہ دو منٹ میں ہی اُس کی عقل ماری گئی۔ پانی کے شراٹے اُس کی ناک سے آنکھوں سے اور منہ سے بہنے لگے اور موت کا مزا آ گیا۔ آخر جب معاملہ اُس کے ضبط سے نکل گیا تو جن کہنے لگا کہ ''تم کیا چاہتے ہو؟'' میں نے کہا ''بس یہی کہ تم اس لڑکی کو چھوڑ دو''۔ کہنے لگا ''اچھا''۔ مَیں نے کہا ''پہلے بھی تم نے ہمیں دھوکا دیا تھا اور ایک منٹ کے بعد پھر واپس آ گئے تھے اس لئے اب تم یہ وعدہ کرو کہ مَیں جاتا ہوں اور پھر کبھی عمر بھر اس کے سر پر نہیں آؤں گا'' اس پر تھوڑی دیر وہ خاموش رہا۔ مگر خاموش رہنا اس خوفناک دوا کی وجہ سے ناممکن تھا۔ مجبوراً اُس نے کہہ دیا کہ ''میں جاتا ہوں، پھر کبھی اس لڑکی پر نہیں آؤں گا۔ یہ میرا پکا قول وقرار ہے''۔

اس پر میں نے اُن لوگوں سے جو اُسے پکڑے ہوئے تھے کہا کہ ''اب لڑکی کو چھوڑ دو'' جب اُسے چھوڑ دیا گیا تو دو منٹ تک وہ بدحواس سی رہی۔ مگر جب مَیں نے ''نوری نوری'' کہہ کر آواز دی تو جواب دیا ''جی''۔

مَیں نے کہا: ''کیا حال ہے؟'' کہا ''اچھی ہوں''۔

مَیں نے پوچھا ''جن اب بھی ہے؟'' کہنے لگی ''چھوڑ گیا''۔ پھر مجھے دیکھ کر سلام کیا۔ اور اپنے باپ کو دیکھ کر اُس کے گلے میں باہیں ڈال کر رونے لگی اور کہنے لگی ''چلو گھر چلو''۔



مَیں نے کہا: ''تو خود ہی اس میز پر سے اُتر کر پیدل باہر جا اور اپنے چھکڑے پر سوار ہو جا''۔ چنانچہ اُس نے ایسا ہی کیا۔

مَیں نے اُس کے باپ سے پکار کر کہا کہ ''جب کبھی پھر یہ جن تمہارے ہاں آئے تو پولیس میں رپورٹ دینے کی ضرورت نہیں۔ تم فوراً سیدھے اسے یہاں لے آنا۔ اور پولیس والوں کو مَیں نے جواب دیا کہ ''مسماۃ نوری پر واقعی سخت جن چڑھا ہُوا تھا میں نے بمشکل اُس کو اپنے عمل سے اُتار دیا ہے''۔

امید ہے کہ آئندہ پھر وہ اس پر نہیں چڑھے گا۔ مگر اس مسمّی جھنڈو نے اس کی طرف نہیں بھیجا تھا بلکہ جنّوں کا ایک بادشاہ ہسٹیریا (Hysteria) نام کوہِ قاف میں رہتا ہے اُس نے اس جن کو اس لڑکی پر بھیجا تھا۔ جھنڈو بے قصور ہے۔ اور اگر خدانخواستہ وہ جن پھر کبھی اس عورت پر آ جائے تو اسے دوبارہ میرے پاس بھیج دینا تاکہ اس جن کو اسمِ اعظم کے عمل کے ساتھ بکّلی جلا کر پھونک دیا جائے۔

## (26) پولیس والوں کی انشاء و اِملا

ذیل میں پولیس کے نقشہ مضروبی کی تحریر کا ایک نہایت اعلیٰ اور منشیانہ نمونہ درج کیا جاتا ہے۔ اور پھر ایسی تحریروں پر فخر کیا جاتا ہے کہ ''بھئی واہ داروغہ صاحب تو بے نظیر منشی ہیں جو لکھ دیا بس پتھر کی لکیر ہے ان کے ہاتھ میں پھنسا ہُوا کبھی پھانسی سے نہیں بچ سکتا خواہ وکیل لوگ ہائی کورٹ تک زور لگا لیں۔ منشی ہے نا منشی!'' اب ان منشیوں کا نمونہ تحریر بھی ملاحظہ ہو:-

بخدمت جناب ڈاکٹر صاحب مضروب مسمّی گنڈا سنگھ آپ کی ڈاکٹری کرانے کے لئے ہمراہ کانسٹیبل نمبر.......... ارسال ہے مضروب کے بدن پر

حسب ذیل نشاناتِ ضرب موجود ہیں۔

(1) یک نشان نیلگوں برگوڈہَ چپ (یعنی چوٹ کا ایک نیلا نشان بائیں گھٹنے پر)

(2) یک نشان دند وَڈْنے کا بر وَگھی جانبِ راست (یعنی دانت سے کاٹنے کا نشان دائیں پسلیوں پر)

(3) پُشت پر کھرْتنچیں اور جھرٹیاں نامعلوم السبب (یعنی پیٹھ پر کچھ خراشیں اور رگڑیں جن کی وجہ معلوم نہیں)

مضروب کہتا ہے کہ مَیں مسمّیان لال وگلاب کے دروازے کے آگے سے گزر رہا تھا۔ وقت لَوڈہ ویلے کا تھا کہ میں نے ایک راس بولد اُن کے دروازہ بربستہ دیکھا میں نے اپنی لکڑی سے اُسے ہٹایا کہ برائے گزر راستہ صاف ہو جائے۔ میری اس حرکتِ معقولہ سے مسمّیان مذکورہ گھر میں سے برآمد ہوکر من مُدّعی کی حُورہْ و مُکّہ و گھسُنْ سے خاطر تواضع کرنے لگے۔ عالی جاہا عندالتفتیش والتحقیقات معاملہ راست راست و بے کم و کاست سچا معلوم ہوتا ہے۔ لہٰذا نقشہَ مضروبی ہمراہ مرسل ہے۔ ضربات کی رپورٹ عنایت فرمائَ جاوے۔ مضروب کو بسوارئَ چارپائی شفا خانہ بھیجا جاتا ہے۔''

یہ وہ فن تحریر ہے جو ایک قرن تک پولیس میں رائج رہا اور اس کو بڑے فخر کے ساتھ منشیانہ طرز کہا جاتا تھا۔ شاید اب کم ہوگیا ہوگا۔

## (27) آپ تو سچے بنیں اور ہم جھوٹ بولیں

ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ ایک شخص میرے پاس رخصت کا سرٹیفکیٹ لینے آیا۔ کہنے لگا۔ ''جناب! آپ جانتے ہیں کہ جھوٹ بولنا اور نجاست کھانا برابر ہے۔ بھلا آپ کے سامنے ہم غلط بیانی کرسکتے ہیں۔ مگر معاملہ ضروری آپڑا



ہے۔ میں رخصت پر یہاں گھر آیا تھا کہ ایک مقدمہ کا جھگڑا کھڑا ہو گیا۔ ایک دو مہینے اس کے نپٹانے میں لگیں گے۔ آپ مہربانی فرما کر اپنی فیس لے لیں اور مجھے دو ماہ کی رخصت بیماری کی لکھ دیں ورنہ میرا بڑا نقصان ہو گا''۔ مَیں نے عرض کیا ''پھر میں نجاست کیوں کر کھاؤں؟'' کہنے لگے۔ ''توبہ، توبہ! بھلا میں ایسی بے ادبی کرسکتا ہوں؟ آپ کی تو قلم کی ایک کشش سے میرا کام بن سکتا ہے''۔ یہ کہہ کر انہوں نے کچھ روپے میرے سامنے رکھ دیئے۔ میں نے کہا کہ ''اتنے سے روپے کے بدلے تو کسی آدمی کے لئے بھی نجاست کھانا مشکل ہے''۔ کہنے لگا ''اچھا دو رپیہ اور لے لیں''۔ میں نے کہا ''پھر بھی نجاست کیوں کر حلق سے اُترے گی؟'' حیران سے رہ کر پوچھنے لگے ''حضرت کون سی نجاست؟'' میں نے کہا کہ ''آپ نے آتے ہی فرمایا تھا کہ جھوٹ بولنا اور گُو کھانا برابر ہے۔ اس لئے مَیں سچ سچ ساری بات عرض کر دیتا ہوں۔ گویا آپ تو راستباز ہیں۔ جھوٹ بولنا اور نجاست کھانا برابر سمجھتے ہیں۔ مگر میرے لئے چند روپے لے کر وہی نجاست کھانا ضروری ہے۔ تشریف لے جایئے۔ جب میری فطرت ایسی مسخ ہو جائے گی کہ نجاست کھانے میں مجھے کوئی عُذر نہ ہو گا۔ پھر میں ایسے سرٹیفکیٹ لکھ دیا کروں گا۔ آپ اپنے آپ کو بیمار ظاہر کر کے اور مجھے دھوکا دے کر تو سرٹیفکیٹ حاصل کر سکتے تھے۔ کیوں کہ ڈاکٹر بھی دھوکا کھا سکتے ہیں۔ لیکن میرے منہ پر یہ کہہ کر کہ جھوٹ بولنا اور نجاست کھانا برابر ہے۔ اس لئے میں تو یہ گندا کام نہیں کرسکتا۔ بلکہ سچ سچ ساری حقیقت بیان کر دیتا ہوں البتہ جس نجاست کو میں نے ترک کیا ہے وہ آپ ضرور کھا لیں یہی مطلب ہے نا آپ کا؟'' کہنے لگے ''آپ تو لفظوں کو پکڑتے ہیں'' مَیں نے کہا ''کیا پھر آپ کا گلا پکڑ لوں۔ اجازت ہے؟'' بے چارے خاموش ہو کر چلے گئے۔

اس قسم کی باتیں ہر ڈاکٹر کو اکثر پیش آتی ہیں۔ لوگ منہ پر گالیاں بھی

دے جاتے ہیں۔ اور سرٹیفکیٹ بھی حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہیں مگر جب اُن سے کہو کہ ''کیا اس نجاست کے نوشِ جان کرنے کے لئے آپ نے اس خاکسار کو ہی منتخب فرمایا ہے''؟ تب اُنہیں بھی پتہ لگتا ہے کہ ہم کیسے شخص سے مخاطب ہیں۔ اور کیا کہہ رہے ہیں۔

## (28) سچی اِصلاح

اک معزز گھرانے کی ہندو بیوہ نے حرام کا بچہ جنا پھر اُس کا گلا گھونٹ کر جنگل میں کوڑی کے اندر دبا دیا۔ کسی مخبر نے رئیس علاقے کو رپورٹ کر دی نعش برآمد ہوگئی اور نشان دہی پر وہ عورت میرے پاس لائی گئی۔ بعد ملاحظہ میں نے رپورٹ کی ''اس عورت نے واقعی حال میں ہی بچہ جنا ہے''۔ پھر اُس عورت نے خود بھی اقرار کر لیا۔ رئیس علاقہ بڑا سمجھ دار آدمی تھا اُس نے اُس شہر کے معزز ہندوؤں کو بلا کر کہا کہ ''یہ معاملہ قتل کا ہے۔ ساتھ ہی تم سب کی بے عزتی اور بدنامی بھی ہے۔ مقدمے پر بھی ہزاروں روپے لگ جائیں گے۔ اور ایک معزز خاندان کی عورت کئی سال کے لئے جیل خانہ میں بھیج دی جائے گی''۔ وہ سب رئیس کے پاؤں پر گر پڑے اور اپنی پگڑیاں اُتار کر اُس کے آگے رکھ دیں۔

رئیس نے کہا: ''مَیں اس شرط پر یہ مقدمہ واپس لے لیتا ہوں کہ تمہاری ساری ہندو برادری میرے ساتھ عہد کرے کہ آئندہ کوئی جوان بیوہ عورت بغیر نکاح ثانی کے میرے علاقے میں نہ رہ سکے گی۔ اور یہ کہ بعد بیوہ ہونے کے ایک سال کے اندر اندر ہم لوگ اُسے کسی جگہ بٹھا دیا کریں گے''۔

سنگ آمد و سخت آمد کیا کرتے فطرتِ صحیحہ بھی یہی کہتی تھی اور موقعہ بھی ایسا ہی پیش آ گیا تھا۔ غرض ایک محضرنامہ پر سب کے دستخط ہو گئے وہ معاملہ



رفع دفع ہوگیا بجائے انفرادی سزا کے ایک قوم کی اصلاح ہوگئی اور گناہ کا سدِّ باب بھی ہوگیا۔

## (29) آچھیں

میرے ہم نام ایک میرے بزرگ دوست تھے اور وہ ڈاکٹر بھی تھے۔ مزید برآں یہ کہ نہایت بامذاق بھی۔ گوڑیانی ضلع رہتک کے رہنے والے تھے۔ ایک دِن اپنا ذاتی واقعہ مجھے سنانے لگے۔ کہ ''مَیں ایک شفا خانہ میں متعین ہو کر گیا تو لمبا تڑنگا وجیہہ اور ریشائیل ہونے کی وجہ سے وہاں میری بزرگی کی بہت جلد شہرت ہوگئی۔ ایک دِن میرے پاس ایک جوان آدمی آیا اور کہنے لگا کہ ''الگ ہو کر کچھ عرض سُن لیں''۔ مَیں اُسے ایک طرف لے گیا تو کہنے لگا کہ ''ہمارے علاقہ کے بزرگ اور پیر تو آپ ہی ہیں۔ خدا کے لئے میری روحانی مدد کریں''۔ مَیں نے کہا ''کیونکر'' کہنے لگا کہ ''اپنے گاؤں کی ایک لڑکی پر مَیں عاشق ہوگیا ہوں۔ اور آج اُس نے کہلا بھجوایا ہے کہ ہمارے پچھواڑے کے احاطہ میں مجھ سے ملنے آ جانا۔ ڈاکٹر صاحب! میرے دشمن بھی آس پاس بہت ہیں کوئی ایسا تعویذ دیں یا مجرّب عمل بتائیں کہ مجھے کوئی نقصان نہ پہنچے''۔ مَیں نے کہا ''تم میرے ہاں تیسرے پہر کو آنا میرے پاس ایک مجرّب عمل ہے یہ ایک نسوار یا ہلاس ہے جو آدمی بھی لاحول پڑھ کر ایک سانس میں اُسے دونوں طرف کے نتھنوں میں داخل کر کے زور سے دماغ میں چڑھا لے وہ پھر چھ گھنٹہ تک کسی کو نظر نہیں آ سکتا۔ لیکن خود سب کو دیکھ سکتا ہے''۔

یہ سُن کر وہ شخص میرے پیروں میں لوٹ گیا اور کہنے لگا۔ ''واہ واہ میرے پیر دستگیر! بس میرا کام تو بن گیا۔ میں تیسرے پہر ضرور آؤں گا''۔

جب وہ چلا گیا تو میں نے کمپاؤڈر کے ہاتھ بازار سے دو پیسے کی نک

چھکنی بُوٹی منگائی اور اسے نہایت باریک پسوا کر ایک پُڑیا بنا کر رکھ لی۔ تیسرے پہر جب وہ آیا تو وہ پُڑیا اُسے دے کے پھر دوبارہ اچھی طرح اُس کے استعمال کی ترکیب سمجھا دی۔ رات کو وہ شخص وعدہ کی جگہ پر پہنچا اور دیوار پھاند کر احاطہ کے اندر داخل ہُوا ہی تھا کہ اُس کی محبوبہ دبے پاؤں سامنے سے آتی ہوئی نظر آئی۔ جھٹ لاحول پڑھ اُس نے وہ پُڑیا کھولی۔ ایک بڑا سا چٹکا بھرا اور دونوں نتھنوں میں دھر دبایا۔ بس پھر کیا تھا خدادے اور بندہ لے۔ ’’آچھیں، آچھیں، آچھیں، آچھیں‘‘

’’کون ہے کون ہے؟ کون ہے؟ پاس ہی سے کوئی سوتا ہُوا آدمی بولا ’’چور، چور، چور،‘‘ عاشق صاحب سمجھے کہ یہ چھینکیں عارضی تھیں بند ہوجائیں گی اور مجھے تو اب کوئی دیکھ بھی نہیں سکتا وہیں جمے کھڑے رہے کہ اتنے میں اور بھی زیادہ زور سے نیا حملہ آچھیں کا شروع ہوا۔ مگر اُس کے پائے ثبات میں تزلزل نہ آیا۔ کیونکہ اُسے یقین تھا کہ اب مَیں کسی کو نظر ہی نہیں آ سکتا۔ آخر گھر والا اُٹھا محبوبہ تو پہلی ہی چھینک کے ساتھ فِرّو ہوگئی تھی۔ گھر والا سیدھا مجرم کو پکڑنے اس کی طرف دوڑا اور کہنے لگا کہ ’’مَیں نے تجھے پہچان لیا ہے۔ او فلانے ٹھہر تو جا۔ جاتا کہاں ہے‘‘؟ اُس وقت اُس شخص کو پتہ لگا کہ مَیں تو لوگوں کو نظر آرہا ہوں۔ یہ جا۔ وہ جا۔ یہاں سے کود ’’آچھیں‘‘ وہاں سے کود ’’آچھیں‘‘ گلی میں ’’آچھیں‘‘ موڑ پر ’’آچھیں‘‘ اتنے میں غل مچ گیا۔ ’’چور، چور،‘‘ آچھیں، آچھیں۔

گاؤں کے لوگ باہر نکل آئے اور تعاقب شروع ہوگیا۔ مگر میاں آچھیں کو بھی اپنی موت نظر آئی تھی۔ اس لئے ٹانگوں میں غیر معمولی طاقت پیدا ہوگئی تھی۔ اگرچہ دوڑنے میں ہرن کو بھی مات کرتے جاتے تھے مگر ’’آچھیں‘‘ کا سلسلہ برابر جاری تھا۔ حتیٰ کہ گاؤں سے باہر نکل آئے مگر ’’آچھیں‘‘ کی وجہ



سے لوگوں نے بھی تعاقب نہ چھوڑا۔ آخر دُور جا کر جب کچھ نہ ہو سکا تو ایک گنے کے کھیت میں گھس کر اندر چھپ بیٹھے۔ اتنے میں لوگ بھی کھیت کے پاس پہنچ چکے تھے۔ کہ اندر سے ’’آچھیں‘‘ کی آوازیں آنی شروع ہوئیں۔ گاؤں والوں نے پہلے تو اُس کھیت کے گرد حلقہ ڈال کر ناکہ بندی کی پھر باقاعدہ پارٹیاں بنا کر اندر داخل ہو گئے۔ اتنے میں ایک لالٹین بھی پیچھے سے آ گئی۔ مگر نشان دہی کے لئے اس کی بھی ضرورت نہ تھی۔ ’’آچھیں‘‘ ہی کافی تھی۔ الغرض پکڑے گئے تو خیر سے اپنے گاؤں کے ہی آدمی نکلے۔ اور وہ بھی دشمن ٹولہ کے۔ آخر یہ فیصلہ ہُوا کہ بجائے پولیس کے حوالہ کرنے کے ان کی اتنی مرمت کر دی جائے کہ پھر ساری عمر دوبارہ ایسا کام نہ کرسکیں۔ چنانچہ ایسا ہی ہُوا ایک جوتا۔ دو جوتے۔ تین جوتے۔ ’’آچھیں‘‘ بھئی چھینک آ گئی ہے پھر سے گنو۔ ایک جوتا۔ دو جوتے۔ تین جوتے۔ ’’آچھیں‘‘ غرض معلوم نہیں کہ کب تک یہ سلسلہ جاری رہا۔ لوگ مارتے مارتے تھک گئے مگر اُس کی ’’آچھیں‘‘ نہ تھمی۔ خیر اچھی طرح پٹ پٹا کر بچارہ اپنے گھر پہنچا تو وہاں اپنے لوگوں نے لعنت ملامت کی۔ لیکن ’’آچھیں‘‘ اُس وقت بھی جاری تھی۔ مگر پھر بھی اُس کے حُسنِ عقیدت میں کمی نہ آئی۔ دوسرے دِن بچارہ ڈاکٹر صاحب موصوف کے پاس پہنچا کچھ حال سُنایا کچھ دکھایا اور کہنے لگا کہ ’’ضرور کوئی کسر رہ گئی ہوگی‘‘۔ اس پر ڈاکٹر صاحب فرمانے لگے کہ ’’اوہو بھئی تمہارے جانے کے بعد یاد آیا کہ مَیں ایک ضروری بات کہنی بھول گیا تھا۔ شاید تم کو میں نے نہیں بتایا تھا کہ باوضو وہاں جانا بے وضو کی ناک میں یہ عمل وہ اثر نہیں کرتا‘‘۔ بچارہ سُن کر کہنے لگا ’’اب تو کان کو ہاتھ لگاتا ہوں ایک دفعہ کسی اور پر آزما کر پھر بتایئے گا۔ میری تو ہمت نہیں پڑتی۔ ایسا نہ ہو پھر کوئی بات رہ جائے‘‘۔

(نوٹ از مصنف) اس قصہ سے ملتا جلتا ایک قصہ فسانہ آزاد میں بھی

پڑھا ہے۔ شاید ڈاکٹر صاحب موصوف نے بھی وہی پڑھ کر اس بے وقوف شخص کو اپنا تختۂ مشق بنایا ہو گا۔

## (30) پلاؤ میں دانت

انہی میرے ہم نام ڈاکٹر صاحب کا ذکر ہے کہ ان کو پلاؤ کھانے کا ازحد شوق تھا۔ اور پلاؤ بھی رکابی میں نہیں بلکہ بڑے طباق یا سینی میں ڈال کر۔ لوگوں کو بھی اُن کا یہ شوق معلوم تھا۔ ایک دِن کسی دوست نے دعوت کی جس میں بہت سے آدمی بلائے گئے۔ میزبان نے سب کے آگے تو پلاؤ کی رکابیاں رکھیں مگر اُن کے آگے ایک بڑی سینی بھر کے رکھوا دی۔ وہ بھی دیکھ کر بہت خوش ہوئے اور کہنے لگے کہ ''طباق یا سینی میں بہت سا پلاؤ سامنے رکھنے کا مجھے صرف شوق ہی شوق ہے۔ میں اتنا کھا نہیں سکتا۔ آپ میں سے تین چار آدمی میرے ساتھ اسی سینی کے کھانے میں شریک ہو جائیں''۔

خیر چند دوست شریک ہو گئے۔ اُن کی یہ بھی عادت تھی کہ خود ہی لطیفہ کہا کرتے تھے اور خود ہی سخت قہقہہ مار کر ہنسا بھی کرتے تھے۔ دعوت میں باتیں کرتے کرتے انہوں نے کوئی بات مذاق والی کہی جسے سُن کر سب ہنس پڑے۔ مگر دوسروں سے زیادہ وہ خود ہنسوڑے تھے۔ اس زور سے منہ کھول کر قہقہہ لگایا کہ منہ کا سارا لقمہ دانہ دانہ ہو کر باغ کے پھوارہ کی طرح نہ صرف ساری سینی پر بلکہ دوسرے ساتھیوں کے کپڑوں اور چہروں پر بھی بکھر گیا۔ اور ساتھ ہی ان کے مصنوعی دانتوں کا ثابت چَوکا منہ سے نکل کر عین سینی کے بیچوں بیچ بمب کی طرح دھنس گیا۔ دیکھنے والوں کے پیٹوں میں ہنس ہنس کر بل پڑ گئے۔ مگر ڈاکٹر صاحب نے بھی بجلی کی سی پھرتی کے ساتھ وہ دانتوں کا چَوکا تو جھٹ منہ میں ڈال لیا اور پکار پکار کر اپنی سینی کے ساتھیوں سے کہنے لگے کہ



''بھئی واللہ کیسا مزیدار پلاؤ ہے آپ لوگ کھاتے کیوں نہیں''؟ مگر وہ بچارے کیا کھاتے اُن کے دانتوں نے تو اس پلاؤ کو کھانے کے قابل چھوڑا ہی نہ تھا۔

## (31) دواؤں کا مرتبان

میرے ایک دوا خور مہربان جو ہر وقت اپنی صحت کا بہت خیال رکھتے ہیں۔ میں اکثر جب بھی اُن سے ملتا تو ہمیشہ یہی سُنتا کہ انہیں شکایت رہتی ہے کہ بھوک بالکل نہیں ہے۔ برسوں میں نے یہ سنا پھر جو معلوم کیا تو حسبِ ذیل حالات اور اسباب اس مرض کے روشنی میں آئے:-

صبح 5 بجے ملازمہ نے آ کر جگایا کہ ''میاں اذان ہو رہی ہے'' میاں نے کہا ''ہوں'' ملازمہ نے کہا ''میاں یہ معجون کھا لیں'' چنانچہ انہوں نے کھا لی۔ تھوڑی دیر میں آواز آئی۔ ''میاں وضو کر لیں'' اور دوسری ملازمہ بولی ''میاں یہ گولی اور عرق پی لیں''۔ چنانچہ پی لی اور وضو کر کے نماز پڑھ لی۔ سلام پھیرتے ہی ہمدرد دوا خانہ دہلی کا ایک قرص اور ماء اللحم دو آتشہ آدھ پاؤ پیش ہوا۔ پی کر لیٹ گئے۔ آٹھ بجے ناشتہ سے پہلے ہندوستانی دواخانہ کا گلقند اور شربت بنفشہ استعمال کئے گئے۔ ناشتہ پھر کیا کرنا تھا۔ مگر اس کے بعد ہاضمہ کا چورن البتہ چاٹا گیا۔ دوپہر کو صرف عرق گاؤ زبان' کیوڑہ اور بید مشک کا ایک گلاس پیا گیا۔ دو بجے بعد دوپہر کھانے سے پہلے مفرح عنبری بمع عرق ماء اللحم سہ آتشہ نوش فرمائی گئی۔ مگر بھوک پھر بھی نہ کھلی کھانے کے بعد نمک سلیمانی اور کوئی اور مرکب سفوف مع عرق سونف معتدل کے پیا گیا۔ اور اُس کے آدھے گھنٹہ بعد معجون سنگدانۂ مرغ۔ عصر کے وقت ایک قدح پھر اسی قسم کے جوشاندہ کا جو گلے اور معدہ کے بلغم کو صاف کرے پیا گیا۔ کہ اتنے میں تیسرے پہر کا ناشتہ اور چائے آئی مگر بوجہ بھوک نہ ہونے کے خواہش کے ساتھ نہ پی جا سکی۔

صرف ایک پِنڈی پسے ہوئے پستوں اور باداموں کی بمشکل کھائی گئی۔ مغرب کی اذان کے وقت معجون فلاسفہ ہمراہ شربت بزوری 3 تولہ اور عرق سونف معتدل آدھ پاؤ۔ کے آہستہ آہستہ کھایا پیا گیا۔ بعد از نماز مغرب دوائے مسکنِ اعصاب مع مفرّح یا قوتی و مربّہ برگ پان کے نوش فرمائی گئی۔ پھر ایک گھنٹہ بعد صبح والی گولی اور عرق دہرائے گئے۔ اور رات کا کھانا کھانے سے پہلے پھلوں کا رس ایک گلاس اس قرص شفاء اور جوارش جالینوس کے ساتھ استعمال کیا گیا۔ مگر جب کھانا آیا تو بھوک نہ تھی۔ مجبوراً بے بھوک ہی کھا لیا گیا۔ عِشاء کی نماز کے بعد سونے تک ملازمہ نے دو دفعہ ایک ایک گھنٹہ کے وقفہ سے بعض لُعوق اور دوائیاں لا کر کھلائیں۔ ایک تو کوئی چھٹانک بھر وزن کا ہو گا اور دوسری ایک گولی بمع شربت اکسیر معدہ جو آدھے گلاس کے قریب ہوگا۔ رات کو نفخ اور قراقر کی وجہ سے بآرام نیند نہ آئی سینہ جلتا رہا۔ چھاتی پر بوجھ تھا اور گلے میں خراش ذرا سوچنے کی بات ہے کہ صرف دوائیں شربت اور عرقیات ہی تین سیر کے قریب جب پیٹ میں جاتی رہی ہوں تو پھر کھانا کس جگہ جائے؟ اور کیونکر ہضم ہو۔ ہر وقت دواؤں کی عادت بھی ایک مصیبت ہے۔ اور سو بیماریوں کی ایک بیماری خدا محفوظ رکھے۔

## (32) بوتل پر لیبل

مَیں لاہور میو ہاسپٹل میں ایک زمانہ میں ہاؤس (House) سرجن بھی رہا ہوں۔ اُس وقت ایک پروفیسر کرنل گرانٹ نامی کچھ دنوں کے لئے کالج کے پرنسپل اور ہسپتال کے سپرنٹنڈنٹ بنا دیے گئے تھے۔ ان میں کامن سنس (Common Sense) بہت تھی۔ ہم چار ہاؤس سرجن شفا خانہ میں بیک وقت موجود تھے۔ ایک دِن کرنل گرانٹ کی آنکھ جو دُکھنے آئی تو آنکھوں کے محکمہ



کے ہاؤس سرجن سے کہنے لگے کہ ''ویل آئی ہاؤس سرجن صاحب! میرے لئے کچھ زنک لوشن آنکھ کی سوزش کے لئے بنا کر بھیج دینا''۔ اُس بچارے نے اپنے ہاتھ سے ایک اچھی سی نئی شیشی دھو کر صاف کی۔ پھر نہایت احتیاط سے تازہ زِنک لوشن بنا کر خود گرانٹ صاحب کے لئے لے کر آیا۔ صاحب نے شیشی ہاتھ میں لے کر کہا۔

گرانٹ صاحب:۔ ''کیا میں تمہارا دشمن ہوں یا تم کوئی پرانا انتقام مجھ سے لینا چاہتے ہو؟''

ہاؤس سرجن:۔ (حیران ہو کر) ''نہیں جناب میں تو آپ کے فرمانے کے بموجب زنک لوشن بنا کر لایا ہوں۔''

گرانٹ صاحب:۔ ''نہیں تو یہ تو شورہ کا تیزاب ہے۔ خالص تیزاب۔ نائٹرک ایسڈ۔''

ہاؤس سرجن:۔ (پریشان ہو کر) ''آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے یہ صرف زنک لوشن ہے اور میں اپنے ہاتھ سے تیار کر کے لایا ہوں۔''

گرانٹ صاحب:۔ ''اس کا ثبوت''

ہاؤس سرجن:۔ ''میں خود اپنے ہاتھ سے بنا کر ابھی سیدھا لئے چلا آ رہا ہوں۔''

گرانٹ صاحب:۔ ''افسوس ہے کہ مَیں نہیں لے سکتا۔ آپ کے پاس جو ثبوت ہے اُس پر آپ خود ہی تسلی پا سکتے ہوں گے۔ میری تسلی نہیں ہے۔ مَیں تو اسے تیزاب ہی خیال کرتا ہوں۔ اسے لے جایئے مَیں ایسی خطرناک چیز اپنی آنکھوں میں نہیں ڈال سکتا۔''

ہاؤس سرجن:۔ ''مَیں آپ کے اِرشاد کا مطلب سمجھا نہیں؟''

گرانٹ صاحب:۔ ''ہاؤس سرجن صاحب! ہر شیشی پر دوا کے نام کا

لیبل ہونا ضروری ہے جس سے معلوم ہو کہ اس کے اندر کیا ہے۔ ورنہ پھر سوائے اعتبار کے ہمارے پاس کوئی ثبوت باقی نہیں رہتا۔ آپ زنک لوشن تو بنا لائے مگر دوا سازی کا پہلا اصول ہی بھول گئے۔ اب میں یہ کہنے میں حق بجانب ہوں کہ یہ تیزاب ہے۔ نہ کہ زنک لوشن۔ اگر لیبل نہ ہُوا کریں تو لوگوں کی جانیں خطرہ میں پڑ جائیں اور جس نے زبانی طور پر جو نام جس دوا کا رکھ دیا اگر وہ مان لیا جائے تو اندھیر آ جائے۔ اس لئے ہر شیشی پر لیبل ضروری ہے تا دھوکا نہ رہے اور بیمار نقصان نہ اُٹھائیں۔''

یہ قصہ ہم سب پڑھے لکھے لوگوں کے لئے جن کے گھروں میں دوائیاں اور شیشیاں رہتی ہیں بہت اچھا سبق ہے۔ اگر بوتلوں پر ہمیشہ لیبل اور دوا کا نام ہوتا تو بیسیوں حادثات سے لوگ بچ جاتے کبھی یہ ہوتا ہے کہ ایک مُدّت کے بعد لوگ بغیر لیبل کے بوتلوں کی دواؤں کے نام خود بھول جاتے ہیں۔ پھر مجبوراً وہ دوا پھینک دینی پڑتی ہے کہ خدا جانے کیا چیز اس بوتل میں تھی۔ اور اس طرح کارآمد اور قیمتی دوائیں بھی ضائع ہوتی رہتی ہیں۔

ایک دفعہ اسی غلطی کے ماتحت کسی شخص نے اپنی آنکھ میں ایسے رِین کی جگہ خالص کاربالک ایسڈ ڈال لیا تھا۔ اور میری ایک ملازمہ نے تیس سال ہوئے کہ نمک کی جگہ میرے سالن پر کوکین چھڑک دی تھی۔ یہ محض خدا کا فضل تھا جو میں بچ گیا۔

## (33) بُخار چڑھانے کی ترکیبیں

ایک دِن مَیں نے کسی مجلس میں کہا کہ ''مَیں جھوٹا سرٹیفیکیٹ نہیں دیا کرتا''۔ وہاں ایک ڈاکٹر صاحب بیٹھے تھے کہنے لگے کہ ''لوگ مجھے تو دھوکا دے لیتے ہیں''۔ میں بولا ''کس طرح''؟ انہوں نے کہا کہ ''پہلے تو بعض لوگ بہت



سا کافور کھا کر آتے تھے تو کچھ بخار اُن کو ہو جاتا تھا۔ پھر ایک زمانہ آیا تو پلیگ کا ٹیکہ کہیں سے کرا کر سرٹیفیکیٹ لینے آ جاتے تھے۔ ان کو 102 یا 103 بخار ہو جایا کرتا تھا۔ مگر اب اس سے بھی زیادہ آسان ترکیب نکلی ہے یعنی دودھ کا ٹیکہ اس سے تو بعض اوقات 105 تک بُخار ہو جاتا ہے۔ بُخار تو ایک رات رہتا ہے مگر ایک ہفتہ کی چھٹی کا سرٹیفیکیٹ ضرور مِل جاتا ہے''۔

## (34) بہت چالاکی بھی نقصان دہ ہو جاتی ہے

ایک تحصیلدار صاحب قبل از وقت پوری پنشن پر ریٹائر ہونا چاہتے تھے۔ ایک دِن انہوں نے اپنا پیشاب مجھ سے ٹیسٹ کرایا تو اُس میں کچھ شکر تھی مگر بہت خفیف۔ مجھ سے کہنے لگے کہ ''مجھے سرٹیفیکیٹ لکھ دیں کہ اس کے پیشاب میں شکر پائی جاتی ہے''۔ مَیں نے سرٹیفیکیٹ لکھ دیا۔ اس کے بعد انہوں نے عرضی دی کہ ''مجھے ذیابیطیس ہو گیا ہے اور شکر آتی ہے مجھے فوراً ملازمت سے ریٹائر کیا جائے''۔ اور ثبوت میں میرا ڈاکٹری سرٹیفیکیٹ پیش کر دیا۔ اس پر حکم آیا کہ تم چونکہ گزٹیڈ افسر ہو اس لئے میڈیکل بورڈ کے رُوبرو پیش ہو۔ اُس کے فیصلہ پر پنشن مل سکے گی۔ چنانچہ تاریخ مقررہ پر وہ بورڈ میں پیش ہوئے۔ وہاں کئی رخصت حاصل کرنے والے لوگ اور بھی کھڑے تھے۔ دفتر کا ایک چپڑاسی سب سے اپنا انعام مانگتا پھرتا تھا۔ باقی سب نے تو کچھ نہ کچھ دے دیا مگر انہوں نے تحصیلداری کے گھمنڈ میں کچھ نہ دیا۔ خیر جب اُن کی باری معائنہ کی آئی تو اُن کو ایک گلاس پیشاب کرنے کے لئے دیا گیا۔ یہ کمرہ کے باہر برآمدہ کے کونہ میں ہی پیشاب کرنے بیٹھ گئے۔ شکر وغیرہ تو زیادہ آتی نہ تھی مگر انہوں نے ایک ڈاکٹر سے پوچھ کر یہ حکمت سیکھ لی تھی کہ اگر گنے کی شکر جو عام طور پر کھائی جاتی ہے پیشاب میں گھول دی

جائے تو وہ پیشاب میں شوگر کا ٹیسٹ دے دیتی ہے۔ اس لئے تحصیلدار صاحب گھر سے ایک پُڑیا شکر کی لے کر گئے تھے گلاس میں پیشاب کرنے لگے تو آہستہ سے وہ پُڑیا کھول کر گلاس میں ڈال دی پھر اُس میں پیشاب کر دیا۔ بدقسمتی سے وہ چپڑاسی جسے اُنہوں نے اپنے فیض انعام سے محروم رکھا تھا یہ بات دیکھ رہا تھا۔ اُس نے اندر جا کر بورڈ کے کسی ممبر کو یہ بات بتا دی کہ اس طرح پیشاب میں اس شخص نے ایک پُڑیا ڈالی ہے۔ جب پیشاب ٹیسٹ کیا گیا تو شکر تو اس میں واقعی نکلی مگر تھی دس فیصدی کے قریب اور جو اُن کی عرضی کے ساتھ پیشاب کے ٹیسٹ کا نتیجہ تھا اُس میں تین فیصدی کے قریب شوگر لکھی تھی۔ غرض شبہ پیدا ہو گیا۔ پھر اُن کو کہا گیا کہ گھنٹہ بھر انتظار کریں۔ اس کے بعد اسی کمرہ کے کونہ میں اُن کا بٹھا کر دوبارہ پیشاب کرایا گیا۔ اس دوسرے پیشاب میں ایک ذرہ شوگر کا نہ تھا۔ جب دَھمکایا گیا تو اُنہوں نے اپنی چالاکی کا اقرار کر لیا۔ آخر اس جرم میں ملازمت سے برخاست ہو گئے۔ اور بجائے پوری پنشن ملنے کے نوکری بھی گئی اور پنشن بھی۔

## (35) مضطرب کی دُعا

1917ء کا ذکر ہے۔ میں پانی پت میں تھا کہ پنڈت تقریباً 45 سال کی عمر کا میرے پاس کبھی کبھی اپنے بارہ سالہ بچے کو علاج کے لئے لایا کرتا تھا۔ بچارہ غریب آدمی تھا مگر سمجھدار۔ لڑکا اس کا اکلوتا بیٹا تھا۔ ایک دفعہ باپ اُسے بخار کے علاج کے لئے لایا اور کئی دِن برابر لاتا رہا۔ یہاں تک کہ تشخیص یہ ہوئی کہ ٹائی فائڈ یعنی میعادی بخار ہے۔ جو عموماً تین ہفتہ تک رہتا ہے۔ بخار کو شاید دسواں دِن ہوگا کہ میں نے کہا کہ ''پنڈت جی! لڑکا اب زیادہ بیمار ہے اور تم اسے پیدل شفا خانہ لاتے لے جاتے ہو۔ تم میاں بیوی دونوں تو ہو ہی اسے



یہیں شفا خانہ میں داخل کر دو اور دونوں اس کے پاس رہا کرو۔ جب اچھا ہوگا تو گھر لے جانا پنڈت جی نے میری بات مان لی۔ گرمی کا موسم تھا میں نے برآمدہ کی ایک طرف اُن کے لئے خالی کرادی اور علاج ہونے لگا۔ مگر بخار بڑھتا ہی چلا گیا حتیٰ کہ اکیسویں دِن بجائے کم ہونے کے 106 کے قریب تھا۔ پھر چوتھا ہفتہ بھی اس طرح گزرا۔ پانچواں بھی۔ چھٹا بھی۔ آخر دو مہینے ہو گئے۔ لڑکا سوکھ کر کانٹا ہو گیا۔ سر کے بال سب جھڑ گئے کانوں سے بہرہ ہو گیا اور بالآخر آنکھوں سے بھی اندھا۔ نہ پہچانتا تھا نہ سنتا تھا نہ سمجھتا تھا۔ صرف بندر کے بچے کی طرح باریک باریک چیخیں مارتا رہتا تھا۔ چُوتڑوں اور کمر پر بڑے بڑے زخم ہو گئے اور بالکل مشتِ استخواں رہ گیا۔ البتہ سانس تھا جو چل رہا تھا۔ ہوتے ہوتے ڈھائی مہینے گزر گئے اور ہر طرح نا امیدی کی صورت ہو گئی۔ اب مرا کہ اب مرا۔

ایک روز رات کے دو بجے کا وقت تھا کہ باپ نے میرے گھر کی کُنڈی کھٹکھٹائی میں باہر آیا تو کہا۔ ''لڑکے کو چل کر ذرا دیکھ لیں''۔ مَیں نے جا کر دیکھا تو نزع کی سی حالت تھی۔ تسلی دے کر کہا کہ ''پنڈت جی! مَیں اور تم دونوں دو ڈھائی مہینہ سے اس مکان کو گرتے دیکھ رہے ہیں۔ اب خدا پر سارا معاملہ چھوڑ دو۔ اور صبر کرو۔ یہ صبح پکڑتا تو نظر نہیں آتا''۔ پنڈت نے بے قرار ہو کر ایک سخت اضطراب کی چیخ ماری اور کہنے لگا۔ ''ڈاکٹر صاحب! یہی ایک میرا بچہ تھا۔ اور آئندہ کے لئے بھی کوئی امید نہیں۔ دیکھئے اس وقت آدھی رات کا وقت ہے اور مرنے والے کے پاس جھوٹ بولنا پاپ ہے۔ پرمیشور حاضر ناظر ہے۔ یہ میری عورت سامنے بیٹھی ہے۔ یہ گواہ ہے کہ اس بچہ کے بعد میرا اس کی ماں سے کوئی تعلق زوجیت کا نہیں رہا۔

اب لڑکا تو جاتا ہے۔ آئندہ کے لئے نسل چلنے کی بھی کوئی امید نہیں

میرے لئے تو سب راستے بند ہو گئے۔ اَے خدا! اَے پرمیشور! رحم کر!'' یہ کہہ کر وہ اس قدر مضطرب ہو کر چیخیں مار کر رویا کہ میرے دِل پر بے انتہا اثر ہُوا اور میں وہاں سے چپکے سے کھسک آیا۔ صبح ہوئی تو میں حیران تھا کہ ابھی تک رپورٹ نہیں آئی کہ وہ لڑکا مر چکا ہے۔ آخر شفا خانہ کے مقررہ وقت پر جا کر اُسے دیکھا۔ تو ابھی زندہ موجود تھا۔ تین چار دِن تک اُس کی وہی معلّق حالت رہی۔ پھر نہایت آہستہ آہستہ سُدھرنی شروع ہوئی۔ یہاں تک کہ ایک ماہ تک اُسے ہوش آ گیا۔ اور کچھ کچھ سُننے لگا۔ پھر ایک ماہ اور گزرا تو چلنے پھرنے، کھانے پینے لگ گیا۔ مگر اندھا تھا اور بہت اُونچا سُنتا تھا۔

مَیں نے کہا:- ''پنڈت جی! مبارک ہو۔ اب تم اسے گھر لے جاؤ اور آب وہوا کی تبدیلی کراؤ۔ لیکن ہفتہ وار اسے دِکھا جایا کرنا''۔ چنانچہ اسی طرح ہوتا رہا۔ رفتہ رفتہ کان بھی ٹھیک ہو گئے اور نظر بھی واپس آنے لگی۔ حتیٰ کہ نو دس مہینے کے بعد بالکل اچھا ہو گیا۔ صرف سر پر بال نہ تھے۔ ایک دِن پنڈت جی لڑکے کو نہلا دُھلا کر نئے بھڑک دار کپڑے پہنا کر میرے پاس لائے۔ اور ایک تھال جس میں شاید ایک روپیہ کی مٹھائی ہو گی میرے آگے سرکا دیا۔

پھر ایک طرف سے اپنی بیوی کو بُلایا۔ وہ بچاری گھونگٹ نکالے میرے قدموں میں آ بیٹھی۔ پنڈت جی اُسے کہنے لگے۔ ''دِکھا بھی اری دکھاتی کیوں نہیں ڈاکٹر صاحب کو''؟ مَیں سمجھا کہ نبض دِکھانی ہو گی یا کوئی بیماری۔ اُس کی طرف توجہ کی تو اُس نے آہستہ سے اپنی جھولی کھول دی دیکھتا کیا ہوں کہ ایک پندرہ بیس دِن کا چاند سا لڑکا گود میں سو رہا ہے۔

مَیں نے کہا:- ''یہ کیا''؟ پنڈت جی مسکرا کر فرمانے لگے کہ ''پرمیشر نے میرے لڑکے کو دوسرا بھائی دیا ہے''۔ یہ سُن کر بجلی کی طرح میرے ذہن



میں ایک سال پہلے کا اُس رات والا واقعہ یاد آ گیا۔

مَیں نے کہا:- ''پنڈت جی! جھوٹ'' کہنے لگے۔ ''خدا ہی کی قسم کھاتا ہوں کہ یہ اُسی کا بھائی ہے''۔ مَیں نے کہا ''اُس کا بھائی تو ہو گا مگر تمہارا بیٹا نہیں ہے۔ کیا آپ کا وہ اُس رات کا اقرار اور اس پنڈتانی کی گواہی کافی نہیں ہے؟ جو تم مجھے دھوکا دیتے ہو''؟ پنڈت روتا ہُوا ہاتھ باندھ کر کھڑا ہو گیا۔ کہنے لگا ''مہاراج وہ بھی سچ تھا۔ اور جو دیکھ رہے ہیں یہ بھی سچ ہے''۔

مَیں نے کہا:- ''پنڈت جی! کون سی بات سچی تھی''؟ کہنے لگے ''مہاراج وہ بھی سچ تھا اور یہ بھی سچ ہے''۔ اس پر مجھے تو وجد آ گیا۔ جی چاہتا تھا کہ وہیں زمین پر اُس رحیم و کریم خدا کے آگے جو مضطرب کی دُعاؤں کو سُنتا اور قبول کرتا ہے سجدہ میں گر جاؤں۔ اور واقعی میرا دِل گر بھی گیا۔ مگر بہت سے لوگ کھڑے تھے جگہ بھی نہ تھی مَیں کچھ شرما گیا۔

پنڈت کہنے لگا:- ''وہ باتیں دِل سے نکلی تھیں اور آدھی رات کو ست دَھرم یعنی یقین و ایمان اور دردِ دِل سے نکلی تھیں۔ میرا لڑکا بھی بچ گیا مَیں بھی صحتیاب ہو گیا۔ اور دوسرا بچہ تو خدا کی خاص دین ہے''۔

مَیں نے کہا:- ''تمہاری بے قراری کی دُعا خدا کو پسند آئی۔ اور اُس نے تو شاید اُس وقت ہی فرما دیا ہو گا کہ تیرے اس لڑکے کو بھی صحت دوں گا اور ایک نیا لڑکا بھی تجھے بخشوں گا''۔

پنڈت جی کہنے لگے ''مہاراج بات یہی ہے''۔

## (36) کہ آئین جہاں گاہے چنیں گاہے چناں باشد

1918ء میں پانی پت ہی کا ذکر ہے کہ ایک شخص مع کئی رفیقوں کے میرے پاس لایا گیا۔ رپورٹ تھی کہ ''اُس کے بُنِ ران یعنی چڑھے میں ایک

دِن پہلے بندوق کے چھرّے لگ گئے تھے۔ اور اس قدر بے حد خون گیا کہ جسم کا رنگ ہلدی کی طرح ہو گیا تھا''۔ دیکھا تو واقعی اُس کے جسم کا خون نچڑ چکا تھا۔ مَیں نے پوچھا:۔ ''کیا معاملہ ہوا''؟ اس کے ساتھی کہنے لگے کہ ''یہ شخص گاؤں میں اچھی حیثیت کا زمیندار ہے۔ کل پولیس بعض مویشی کے چوروں کے تعاقب میں پھر رہی تھی کہ یہ بھی بطور امداد ان کے ساتھ چل پڑا۔ ایک جنگل میں اُن کا چوروں سے مقابلہ ہو گیا۔ وہ نہر کے پرلے کنارے پر تھے اور یہ ورلے کنارے پر۔ ان کو دیکھ کر چوروں نے فائر کر دیا۔ بہت سے چھرّے اس شخص کے بائیں چڈھے میں گھس گئے۔ اور وہ جگہ چھلنی کی طرح ہو گئی۔ یہ گر پڑا۔ ہم اسے اُٹھا کر گھر لے آئے۔ مگر خون کسی طرح بند نہ ہوتا تھا۔ آخر جب بہتے بہتے اس کے جسم میں خون ہی نہ رہا تو پھر بند ہو گیا۔ اب اسے داخل شفا خانہ کر کے علاج کریں''۔

چنانچہ مَیں نے اُسے دیکھا تو معاملہ ویسا ہی تھا جیسا بیان ہُوا تھا۔ جس جگہ چھرّے لگے تھے وہاں جسم کی بڑی بڑی خون کی نالیاں تھیں اور ایک چھرّے سے ان میں بھی سوراخ ہو گیا تھا۔ خیر میں نے اُسے رکھ لیا اور ڈریسنگ وغیرہ کا حکم دے دیا مگر۔ یہ مجھے معلوم تھا کہ جب جسم میں نیا خون پیدا ہو گا۔ اور زخم میں سے چھیچھڑے وغیرہ صاف ہو کر نکلنے شروع ہوں گے تو شریان کا وہ سوراخ جو عارضی طور پر بند ہو گیا ہے پھر کھل جائے گا اور خون پھر اُسی طرح جاری ہو جائے گا۔ جیسے پہلی دفعہ ہُوا تھا۔

وہ آدمی متمول تھا اور اُس کے پاس کئی خدمتگار ہر وقت رہتے تھے۔ مَیں نے اُن سے کہہ دیا کہ ''اس کو کچھ دِن کے بعد یک دم پھر خون جاری ہو جائے گا۔ اور خواہ کوئی وقت بھی ہو تم فوراً مجھے اطلاع دے دینا۔ شرم نہ کرنا کہ ڈاکٹر صاحب آرام میں ہیں ورنہ اس کی خیر نہ ہو گی''۔



وہ شخص جوان اور تندرست تھا بہت جلد اُس کی صحت ترقی کرتی گئی اور زخم بھی صاف ہوتا گیا۔ یہاں تک کہ بارھویں دِن رات کے ایک بجے کسی نے میرے گھر کی کنڈی کھٹکھٹائی۔ اور آواز دی کہ شیر خاں کے زخم سے خون جاری ہو گیا ہے۔ میں فوراً اُٹھ کر سیدھا اُس کے پلنگ پر پہنچا اور لالٹین کی روشنی میں دیکھا کہ وہ چت پڑا ہے اور اُس کے زخم کی جگہ سے ایک موٹی دھار لہو کی فوارہ کی طرح دو فٹ اُچھل اُچھل کر نکل رہی ہے اور جس طرح شالامار باغ کے فوارے میلۂ چراغاں میں چلا کرتے ہیں۔ اسی طرح اسی خونی فوارہ کا بھی حال ہے۔ خیر مَیں نے جاتے ہی اس سوراخ پر اپنی انگلی رکھ دی جہاں سے خون کی دھار اُچھل کر نکل رہی تھی۔ اور خون بند ہو گیا پھر میں نے آدمی بھیج کر اپنے تینوں کمپونڈروں کو بلا کر کہہ دیا کہ صبح 8 بجے اس کا آپریشن ہو گا۔ چھ گھنٹہ باقی ہیں۔ آپ لوگ دو دو گھنٹہ کی ڈیوٹی لے لیں۔ آپ کا کام صرف یہ ہے کہ اس دھار کی جگہ اپنی انگلی برابر رکھے رہیں تا کہ خون ضائع نہ ہو سکے۔ اور بس اس کے بعد میں تو واپس چلا آیا۔ اور وہ لوگ اپنی ڈیوٹی سرانجام دیتے رہے۔ صبح چھ بجے اُٹھتے ہی آپریشن کی تیاری شروع ہو گئی۔ آٹھ بجے تک بیمار میز پر اور مَیں چاقو ہاتھ میں لئے کھڑا تھا۔ غرض کلورافارم دیا گیا اور مریض کا پیٹ چاک کر کے چھرّہ کے سوراخ سے اُوپر اس شریان کو ریشم کے تاگے سے باندھ دیا گیا۔ پھر پرانے زخم سے اُنگلی اُٹھا کر دیکھا تو خون بالکل بند تھا۔ میں نے شکر کیا کہ خون بہنے کا مستقل انسداد ہو گیا۔ مگر ابھی ایک اور خطرہ لاحق تھا۔ وہ یہ کہ اس آپریشن سے بائیں ٹانگ اور دورانِ خون بالکل بند ہو گیا تھا۔ بعض حالات میں یہ بند نہیں بھی ہوتا۔ مگر اس کا بند ہو گیا تھا۔ نتیجہ یہ ہُوا کہ تیسرے دِن کے بعد وہ ٹانگ بے جان ہو کر سڑنے لگی اور ایک ہفتہ تک ساری کالی پڑ گئی۔ مجبوراً دوسری دفعہ آپریشن کرنا پڑا۔ اور ساری ٹانگ بن ران تک کاٹ کر

علیحدہ کر دی گئی۔ اس کے بعد پھر کوئی حادثہ نہیں ہوا۔ زخم بہت اچھی طرح بھرتا رہا مگر آدمی ایک ٹانگ کا رہ گیا۔ جب میں اُسے دیکھنے جاتا تو کہا کرتا کہ غنیمت ہے جان تو بچ گئی۔ میرے پاس کھانے پینے کو بہت کچھ ہے مگر چونکہ اب میں چلنے پھرنے سے معذور ہوگیا ہوں ضرورت کے لئے ایک مصنوعی ٹانگ جیسی آپ فرماتے ہیں لگوالوں گا اور دِل بہلانے کے لئے ایک مشین سلائی کی خرید لوں گا اور شوقیہ درزی بن جاؤں گا۔

خیر اس طرح وہ تقریباً اچھا ہوگیا کہ 1918ء کے انفلوئنزا کی وبا پھوٹ پڑی اور اُس کے گاؤں سے خبر آئی کہ لوگ مکھیوں کی طرح مر رہے ہیں۔ یہی حال خود پانی پت شہر کا تھا۔ اس لئے وہ بھی اجازت لے کر اپنے گاؤں چلا گیا اور کہہ گیا کہ مصنوعی ٹانگ میں آپ کی معرفت اور آپ کی صلاح سے خریدوں گا اور کبھی کبھی مشورہ کے لئے بھی آتا رہوں گا۔

وہ تو چلا گیا۔ مگر اس کے بعد انفلوئنزا نے دُنیا کو سب کچھ بھلا دیا۔ جب اس مصیبت سے ذرا ہوش آیا تو اور مصروفیتوں کی وجہ سے مجھے اس کا کبھی خیال بھی نہیں آیا۔ اسی طرح ایک سال پورا گزر گیا۔ ایک دِن کیا دیکھتا ہوں کہ ایک شخص لاٹھی ٹیکتا اور ایک ٹانگ سے کودتا پھدکتا سامنے سے چلا آرہا ہے۔ اُس کی صورت پر ایسی سیاہی، مفلسی اور نحوست برس رہی تھی کہ مَیں نے اُسے مطلق نہ پہچانا۔ نزدیک آکر اُس نے سلام کیا اور کہا کہ ”آپ نے شاید مجھے نہیں پہچانا۔ مَیں پچھلے سال والا شیر خان ہوں“۔

مَیں حیران رہ گیا۔ پوچھا ”شیر خان یہ کیا حال ہے“؟ کہنے لگا ”قسمت! اُسی وقت مرجاتا تو اچھا تھا۔ اس وقت میرے اتنے رفیق تھے۔ اتنے خدمتگار تھے۔ جب ہم گاؤں پہنچے تو انفلوئنزا سے وہ سارے کے سارے مر گئے جو ہٹے کٹے اور تندرست تھے۔ اور میں جو بیمار تھا اکیلا رہ گیا۔ چند روز



کے بعد مخالف رشتہ داروں نے میری ساری زمینیں ہتھیا کر خود کاشت کرنی شروع کر دیں۔ میں تن تنہا، لنگڑا اور معذور بھلا کیا کر سکتا تھا۔ آخر انہوں نے مجھے گاؤں سے بھی نکال دیا۔ یا تو وہ امارت تھی یا اب بھیک مانگتا پھرتا ہوں“۔

مَیں نے کہا: ”تم تو کہتے تھے کہ سلائی کی مشین لے لوں گا۔ بلا سے درزی کا کام ہی کر لیتے“۔ کہنے لگا ”سلائی کی مشین کیسی؟ مجھے تو اب ایک اچھی سی بانس کی لاٹھی خریدنے کی بھی توفیق نہیں۔ جو ذرا سیدھا ہو کر ہی چل پھر سکوں وہ مصنوعی ٹانگ پانچ سو روپے میں لینے اور سلائی کی مشین دوسو میں خریدنے کے بھی خواب ہی تھے۔ اب تو آدھے پیٹ روٹی بھی مل جائے تو غنیمت ہے“۔

یہ کہہ کر وہ چشمِ پُر آب ہوگیا اور مَیں بھی۔ کیونکہ مَیں نے اُس کی جو شان گزشتہ سال دیکھی تھی۔ کہاں وہ حال اور کہاں یہ۔

وَ تِلْکَ الْاَیَّامُ نُدَاوِلُھَا بَیْنَ النَّاسِ ط

## (37) ریلوے چور

پانی پت ہی کا واقعہ ہے کہ ایک دفعہ گرمیوں میں عین نصف شب کو مجھے اطلاع ملی کہ پنجاب میل کے نیچے آکر ایک شخص زخمی ہوگیا ہے۔ اسے ریلوے اسٹیشن پر سے ڈریسنگ کر کے سول ہسپتال بھیجا گیا ہے اور ریل کے قلی اس زخمی کو چار پائی پر ڈال کر شفاء خانہ میں لائے ہیں۔ میں نے باہر نکل کر اُسے دیکھا۔ دونوں پنڈلیوں پر سے گاڑی کے پہیے پھر گئے تھے۔ ہڈیاں چور چور ہوگئی تھیں۔ اور دونوں ٹانگیں اس قابل تھیں کہ اُن کو گھٹنوں پر سے کاٹ کر الگ کر دیا جائے۔ میں نے مضروب کو مارفیا کا ٹیکہ لگا دیا۔ اور صبح تک انتظار کرنے کے لئے کہہ دیا۔ وہ پورے ہوش میں تھا۔ اور اپنی موجودہ مصیبت پر

صابر و شاکر نظر آتا تھا۔ مَیں نے کہا: ''تمہیں یہ حادثہ کیونکر پیش آیا''؟ کہنے لگا ''ڈاکٹر صاحب! آخر کسی دِن یہ پیش آنا ہی تھا۔ سو آج ہی آ گیا۔ معاملہ یہ ہے کہ میں پرانا ریلوے چور ہوں یعنی گاڑی میں چوری کیا کرتا ہوں میرا علاقہ بارہ سال سے یہی دہلی کالکا لائن ہے۔ پولیس شروع سے ہی میرے پیچھے لگی ہوئی تھی مگر میں آج تک پکڑا نہیں گیا تھا۔ لیکن آج پولیس نے نہیں بلکہ خدا نے پکڑ لیا''۔ مَیں نے کہا: ''کیا بات ہوئی''؟ کہنے لگا ''گیارہ بجے شب کو ڈاک یہاں کے اسٹیشن پر پہنچتی ہے۔ اُس وقت انگریز لوگ ریل میں سونے کی تیاری کرتے ہیں۔ اور اُن کے بیرے جو نوکروں کے کمپارٹمنٹ میں ہوتے ہیں۔ اُنہیں شب بخیر کہنے فسٹ کلاس گاڑی میں جایا کرتے ہیں حسبِ معمول آج بھی جب نوکروں کا خانہ خالی تھا اور خانساماں وغیرہ اپنے صاحب لوگوں کی گاڑیوں میں گئے ہوئے تھے تو میں سرونٹ کے خانہ میں چڑھ گیا وہاں دو (2) کوٹ ٹنگے ہوئے تھے۔ اُن کی جیبوں میں جلدی جلدی ہاتھ مار کر مَیں نے گھڑیاں اور نقدی کے بٹوے نکالے اور دوسری طرف سے دروازہ کھول کر فٹ بورڈ پر کھڑا ہو گیا۔ اتنے میں ڈاک گاڑی چل دی۔ پلیٹ فارم کی طرف سے وہ خانساماں لوگ اپنے خانہ میں داخل ہوئے اور مَیں نے دوسری طرف سے زمین پر چھلانگ لگائی۔ مالِ غنیمت میرے پاس تھا ہی مگر قسمت میں نہ لکھا تھا۔ چھلانگ لگاتے ہی پاؤں میں سگنل کا تار اُلجھ گیا۔ چکرا کر لوٹ پوٹ ہو گیا۔ مگر گردن اور دَھڑ کی جگہ دونوں ٹانگیں ریل کے نیچے کچلی گئیں پھر بھی خیریت گزری میری چیخیں سُن کر گاڑی کھڑی کر دی گئی۔ اتنے میں صاحب لوگوں کے نوکروں کو بھی اپنی چوری کا علم ہو گیا اور سارا معاملہ ریلوے پولیس پر کھل گیا۔ مجھے ڈریسنگ کر کے ریلوے ڈاکٹر نے آپ کے پاس بھیج دیا۔ اگر بچ گیا تو جو مقدمہ چلے گا سو چلے گا ہی''۔



خیر رات تو جُوں تُوں کر کے گزری۔ دِن چڑھا تو مَیں نے اُسے بے ہوش کر کے دونوں ٹانگیں گھٹنوں پر سے کاٹ ڈالیں۔ پھر مریض کو چھپر وارڈ میں جو میرے مکان سے زیادہ قریب تھا رکھ دیا۔ اور مَیں خود شفاء خانہ کا کام کرنے پرلی طرف چلا گیا۔ دو (2) بجے گھر میں آیا۔ وہ رمضان کا مہینہ تھا۔ میری بیوی نے سُنایا کہ ایک شخص نے مجھے ہمارے نوکر کے ہاتھ پیغام بھیجا کہ بیگم صاحب سے عرض کر دو کہ ایک ریلوے چور ہسپتال میں آیا ہُوا ہے اُس کی دونوں ٹانگیں آپ کے ڈاکٹر صاحب نے کاٹ دی ہیں۔ وہ کہتا ہے کہ مجھے دودھ تو مل گیا ہے مگر کچھ برف اور آم درکار ہیں آپ فوراً ان دونوں کا انتظام کرا دیں۔

میری بیوی کو چونکہ گزشتہ رات اس کے شفا خانہ میں داخل ہونے اور اس کی قابلِ رحم حالت وغیرہ کا علم تھا اس لئے اُس نے جھٹ پٹ یہ دونوں چیزیں بازار سے منگوا کر اُسے بھیج دیں۔ بس پھر کیا تھا پانچ پانچ منٹ کے بعد پیامبر آتا تھا۔ بیگم صاحب کو کہہ دو کہ ''ایک گلاس میرے لئے بھیج دیں''۔ بیگم صاحب کو کہہ دو کہ ''ذرا سا نمک بھیج دیں''۔ بیگم صاحب کو کہہ دو کہ ''ایک تولیہ مجھے درکار ہے''۔ بیگم صاحب سے کہہ دیں کہ ''کوئی عمدہ عطر ہو تو کچھ بھیج دیں۔ کلوروفارم کی بدبو سے دماغ پریشان ہے''۔ بیگم صاحب سے کہہ دیں کہ ''الائچی ڈال کر ایک پان تمباکو والا بھیج دیں''۔

غرض دو گھنٹوں میں دس مطالبات اُس کے بیگم صاحبہ کی خدمت میں پہنچ گئے اور پورے بھی کر دیے گئے جب مَیں گھر آیا تو یہ سب حال معلوم ہوا۔ مَیں نے کہا: ''یہ شخص پہلے چوریاں کیا کرتا تھا۔ اب اُس نے ڈاکہ ڈالنا شروع کر دیا ہے۔ مَیں نے اُس کے لئے ہر چیز کا بآرام کا بندوبست کر دیا ہے تم اس بدمعاش کو منہ نہ لگاؤ''۔ کہ اتنے میں چھپّر وارڈ میں سے ہمارے گھر کے قریب

ہی تھا آوازیں آنی شروع ہوئیں۔ ''بیگم صاحب! بیگم صاحب جی!! بیگم صاحب!!! رحم کرو۔ رحم کرو، اجی بیگم! بیگم صاحب!! ارے کوئی بیگم صاحب سے جا کر کہہ دو کہ ریلوے چور جس کی ٹانگیں کٹی ہیں جامنیں مانگتا ہے''۔ خیر وہ تو پہلا دِن تھا۔ جامنیں بھی آ گئیں۔ مگر مَیں نے یہ انتظام کر دیا کہ آئندہ اس کا کوئی پیغامبر ہمارے گھر میں نہ آئے۔ بلکہ ایک کمپاؤڈر کی ڈیوٹی بھی لگا دی کہ جو چیز مناسب اور ضروری ہو وہ اس کے لئے بازار سے منگوا دی جایا کرے۔

اس کے بعد وہ شخص تندرست ہونا شروع ہُوا اور اُس نے شفا خانہ کی زندگی بڑے ٹھاٹھ کے ساتھ شروع کی۔ دوسرے تیسرے دِن ہی مجھ سے کہنے لگا کہ ''اب میں انبالہ میں سلائی کی مشین خرید کر اور درزی بن کر گذارا کروں گا۔ چار دفعہ قید بھگت چکا ہوں۔ اسی ریلوے کی چوری کی بدولت یہ پانچویں دفعہ ہوگی۔ دیکھئے کیا سزا ہو''۔ خیر آٹھویں دِن اُس کے ٹانکے کاٹ دیے گئے۔ زخم اچھے ہو چکے تھے۔ رمضان کا آخری روزہ تھا۔ کہنے لگا ''مجھے ایک گھنٹہ کے لئے کل عید گاہ جانے کی اجازت مل جائے''۔ مَیں نے کہا۔ ''کیونکر جاؤ گے''؟ کہنے لگا۔ ''کسی کو پیسے دے کر اُس کے کندھے پر چڑھ جاؤں گا۔ ذرا مسلمان بھائیوں کی عید رونق تو دیکھ لوں[1]''۔ مَیں نے اجازت دے دی اور وہ دوسرے

1 صد ہزار افسوس! کہ اب وہ عید اور اُس کی رونق سب خواب و خیال ہو گئے۔ نومبر 1947ء میں مسلمانانِ پانی پت کی چالیس ہزار آبادی کو نہایت درجہ ناچاری و بے بسی اور انتہائی بے سروسامانی کی حالت میں سخت مجبوری کے ساتھ سِکھوں اور ہندوؤں نے فوج اور پولیس کی مدد لے کر اُن کے گھروں سے نکال دیا۔ اُن کے مال و اسباب، زمین و جائداد پر زبردستی قبضہ کر لیا اور اُن کی مسجدوں اور عیدگاہ کو ڈھا دیا۔ اور اس طرح مسلمانوں کی ایک ہزار برس کی



دِن اچھی طرح دونوں ٹانگوں کی پٹیاں خوب نمایاں کر کے شفا خانہ کے مہتر کی گردن پر سوار ہو گیا اور کہنے لگا کہ ''چل عید گاہ لے چل۔ تجھے تیرا حق پورا دوں گا۔ بس آج ہی کمائی کا دِن ہے''۔ وہ بھی لالچ میں آ گیا۔ عید گاہ میں وہ چور اپنی کٹی ہوئی ٹانگیں دِکھاتا اور خیرات وصول کرتا پھرا حتّٰی کہ دس پندرہ روپے وصول ہو گئے۔ اُن میں سے مہتر کو ایک روپیہ دیا۔ باقی جیب میں رکھے۔ اس کے بعد پھر اُس نے روزانہ یہی معمول کر لیا کہ مہتر کی پشت پر سوار ہو کر بازاروں میں نکل جاتا اور دو چار روپیہ باقاعدہ کمائی کر لاتا۔ مَیں نے یہ حال سُن کر پوچھا تو کہنے لگا۔ ''مَیں اپنی سلائی کی مشین کے لئے سرمایہ جمع کر رہا ہوں''۔ اچھا تو وہ جلدی ہی ہو گیا تھا مگر اس کے مقدمہ کی پیشی مجسٹریٹ کے روبرو ہونی باقی تھی۔ اس وجہ سے اُسے شفاخانہ سے رخصت نہیں ملتی تھی۔ آخر وہ تاریخ بھی آ گئی۔ مجسٹریٹ صاحب کو مَیں نے صاحب ڈپٹی کمشنر سے

بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ: تہذیب و شائستگی کو ملیا میٹ کر ڈالا۔ یہ داستان بے حد دردناک اور حد سے زیادہ دلخراش ہے۔ جب پانی پت کی بربادی اور مسلمانانِ پانی پت کی تباہی کا خیال آتا ہے۔ کلیجہ پر سانپ لوٹ جاتا ہے۔ بڑی بڑی نایاب لائبریریوں اور عظیم الشان علمی ذخیروں کو ظالموں نے جلا جلا کر اور پھاڑ پھاڑ کر برباد کر دیا۔ ہم خانماں برباد لوگ جب تک زندہ رہیں گے اپنی علمی بربادی پر خون کے آنسوؤں سے روتے رہیں گے۔ خود میرا بڑا عجیب وغریب کتب خانہ تھا۔ اور میں نے بڑی محنت اور نہایت شوق سے اُسے جمع کیا تھا۔ لیکن اِس فتنہ عظیمہ سے سارے کا سارا تباہ ہو گیا۔ جن علمی مسودات پر مَیں نے تیس (30) برس محنت کی تھی سب ہی تو برباد ہو گئے۔ اور مَیں اُن کو یاد کر کے آج حسرت کے ساتھ آہیں بھر رہا ہوں۔ اللہ تعالیٰ مجھے صبر کی توفیق دے۔ (آمین)

محمد اسمٰعیل پانی پتی

سفارش کر کے شفا خانہ میں ہی عدالت کرنے کا حکم دلوا دیا تھا۔ وہ مع عملہ کے تشریف لے آئے۔ مِسل مقدمہ کی پیش ہوئی تو معلوم ہُوا کہ چار دفعہ کا سابق سزا یافتہ ہے۔ اب جو بھی سزا ملے گی وہ پہلی سزا سے دُگنی ہونی چاہیے۔ قاعدہ ہی ایسا ہے۔ مَیں نے عدالت سے کہا کہ اب تو خدا نے ہی اس سے انتقام لے لیا ہے۔ اور یہ ریلوے چوری کے قابل ہی نہیں رہا۔ آپ فیصلہ میں یہ لکھ دیں کہ ”چونکہ قدرت خود ہی اس سے پورا پورا انتقام لے چکی ہے۔ اس لئے مزید سزا دینے کی ضرورت نہیں“۔

صاحب مجسٹریٹ کہنے لگے۔ ”کیا بالکل ہی چھوڑ دوں؟ یہ تو ناممکن ہے اور قواعد کے برخلاف“۔ مَیں نے کہا: تابرخاستگی عدالت یعنی دس منٹ کی سزا دے کر اسے دفع کیجئے۔ چنانچہ یہی کیا گیا اور اُس شخص کو شفا خانہ کے ملازمین نے دوسرے دِن انبالہ کی گاڑی میں سوار کروادیا۔ ہم نے بھی شکر ادا کیا۔ کیونکہ اُس کے مطالبات تعیش ہمارے لئے ناقابلِ برداشت ہوچکے تھے۔ اور روزانہ جو وہ شخص ایک مزدور کی گردن پر سوار ہوکر بازاروں میں کمائی کرتا پھرتا تھا اس میں بھی شفا خانہ کی بدنامی تھی۔

## (38) ہر پیشے میں چالاک آدمی ہوتے ہیں

ہر پیشہ میں اچھے آدمی بھی ہوتے ہیں اور بُرے بھی۔ ہمارے پیشہ میں بھی یہی حال ہے۔ ایک کمپاؤڈر میرے پاس تھا جو بیماروں کو کلوروفارم سُنگھایا کرتا تھا۔ وہ آپریشن سے پہلے مریض اور اُس کے رشتہ داروں کو یہ سُنا دیا کرتا تھا کہ ”آپریشن کیا چیز ہے جان تو دراصل میرے ہاتھ میں ہے۔ جسے چاہوں اس کا مُردہ میز سے ہی اُٹھے“۔ ایک دو دفعہ ایسی بات سُنانے کی دیر تھی کہ آپریشن سے پہلے ہی اُس کی مٹھی گرم ہوجاتی تھی۔



ایک اور صاحب تھے۔ کسی چھکڑے والے کے چھکڑے سے بازار میں کسی آدمی کو کچھ چوٹ آگئی۔ وہ شفا خانہ آکر زخم کو پٹی لگوا گیا۔ آپ نے اُس سے اُس ٹھیلے والے کا پتہ پُوچھ لیا۔ پھر ٹھیلے والے کے گھر پہنچے اور کہا کہ ”ضرب شدید ہے اب بچہ جی تین سال کی قید تجھے ہونے والی ہے“۔ وہ بچارہ ڈر گیا۔ کہنے لگا۔ ”کیا کروں اور کس طرح بچوں“؟ فرمانے لگے۔ ”پانچ روپیہ دلوا تو میں معاملہ ملیا میٹ کرا دوں“۔ ٹھیلہ والے نے اُسی وقت بھینٹ چڑھائی اور مطمئن ہوگیا۔ اور آئندہ کے لئے بھی شکر گزار رہا۔ کیونکہ کوئی مقدمہ نالش تو اس معاملہ میں تھی ہی نہیں۔ صرف کمپوڈر صاحب کی کارستانی تھی اور بس۔

ایک اور بزرگوار تھے جو چند دِن کے بعد بیمار کے زخم کو چھیل دیا کرتے تھے۔ اور اس طرح چھڑا اُتار کر اپنا ٹیکس وصول فرمایا کرتے تھے۔ بعض بعض اُن میں سے واقعی دِل کی توجہ کے ساتھ بیمار کی خدمت بھی کیا کرتے تھے۔ ایک دِن ایک ڈسپنسر نے کسی بیمار کو کونین کا مکسچر پلایا۔ وہ آکر مجھے کہنے لگا کہ ”لکھا تو آپ نے کونین مکسچر تھا مگر تھا بالکل پانی کی طرح پھیکا“۔ مَیں نے کونین مکسچر کی بوتل منگا کر جو اُسے چکھا تو خالص پانی۔ مَیں نے کہا ”ارے بھئی کیہڑی مل! یہ کیا بات ہے“؟ فرمانے لگے ”شاید مَیں اس میں کونین ڈالنا بھول گیا“۔

مَیں نے پوچھا:- ”پھر وہ کونین کہاں گئی جو تمہیں کل نکال کر نہ دی تھی“؟

اُس نے جواب دیا:- ”اجی وہ پُڑیا میں تھی۔ پُڑیا میں نے میز پر رکھی تھی کوئی بدمعاش اُڑا کر لے گیا“۔

مَیں نے کہا:- ”یہ تو چوروں میں مور والی مثل ہوگئی“۔ بہترین سزائیں بھی ایسے لوگوں کو دیں مگر کچھ اصلاح نہ ہوئی۔

ایک دفعہ ایک لوہار قوم کا بیمار جو داخل شفا خانہ تھا اُس نے شکایت کی کہ ''ڈریسر مجھ سے ایک کھرپے کا مطالبہ کرتا ہے۔ اور تکلیف دیتا ہے''۔ تحقیقات پر معلوم ہُوا کہ معاملہ درست ہے۔

مَیں نے کہا:- ''عمدہ کھرپا کتنے میں بنتا ہے''؟

لوہار نے کہا:- ''چودہ آنہ میں''۔

میں نے ڈریسر پر چودہ آنے جرمانہ کر دیے اور اُس لوہار کو وہ پیسے دلوا دیے مگر ناجائز وسائل کی آمدنی بند کرنی نہایت مشکل امر ہے۔

## (39) ایک سیکنڈ میں رُخصت ہُوا

ایک دِن میں شفاخانہ میں بیٹھا تھا کہ ایک جوان عمر آدمی کمرہ کے اندر میرے سامنے دیوار کے پاس جو بینچ پڑا تھا اُس پر آ کر بیٹھ گیا۔ مَیں نے کہا ''کیا تکلیف ہے''؟ کہنے لگا ''پیٹ میں کچھ درد ہے اور نفخ ہے''۔ مَیں یہ کہہ کر اپنی کرسی سے اُٹھا کہ ''ذرا اِسی بینچ پر لیٹ جاؤ میں تمہارا پیٹ دیکھ لوں''۔ وہ لیٹ گیا۔ اور جب مَیں بینچ کے پاس پہنچا کہ مریض کا ملاحظہ کروں تو کیا دیکھتا ہوں کہ وہ مر چکا تھا۔

## (40) یہ تو مجھے بھی معلوم نہیں

1925ء میں مَیں گوجرہ میں تھا۔ وہاں ہسپتال کے احاطہ میں بکثرت آم کے درخت تھے۔ اور اُن دنوں میں پھل بھی بکثرت آیا ہُوا تھا۔ مگر کچّا تھا۔ ایک چودہ سالہ لڑکا میرے ہی اپنے ایک مہربان کا وہاں آیا۔ اور سیدھا درخت پر چڑھ گیا۔ پندرہ بیس آم توڑ کر جھولی میں ڈالے۔ جب نیچے اُترا تو مالی کا ہاتھ اُس کی گردن پر تھا۔

مالی نے کہا:- ''تُو کون ہے''؟



اُس نے کہا:- ''مَیں کسی آدمی کا لڑکا ہوں''۔

مالی نے پوچھا:- ''یہاں کیوں آیا''۔

لڑکا بولا:- ''ایک بِلا میرے سامنے اس درخت پر چڑھا تھا۔ پھر اُوپر جا کر غائب ہو گیا۔ مَیں اُسے دیکھنے اُوپر گیا تھا کہ کہاں غائب ہو گیا ہے''۔ اس پر مالی نے دریافت کیا کہ ''یہ آم کہاں سے آئے''؟ جواب دیا کہ ''یہ تو مجھے بھی معلوم نہیں''۔ آخر پکڑا ہُوا میرے سامنے لایا گیا میں نے اُسے پہچان لیا کہ فلاں دوست کا بیٹا ہے۔ مَیں نے کہا: ''چھوڑ دو اس کا بھی ایک حق ہے''۔

## (41) اندھوں کی قِسمیں

ایک دِن مسجد میں کھڑے ہوئے ایک صاحب غُل مچا رہے تھے کہ کوئی شخص میرا جوتا پہن گیا اور اپنا جوتا اُس کی جگہ چھوڑ گیا۔ وہیں ایک اور صاحب بھی موجود تھے کہنے لگے ''پیروں کا اندھا ہو گا''۔ مَیں نے پوچھا ''پیروں کا اندھا کیسا ہوتا ہے''؟ فرمانے لگے ''پانچ قِسم کے اندھے ہمارے تجربہ میں آئے ہیں۔ ایک[1] تو ظاہری آنکھوں کا اندھا۔ جسے واقعی کچھ نظر نہیں آتا دوسرا[2] عقل کا اندھا تیسرا[3] پیروں کا اندھا جس کے پیر اندھیرے میں اپنی جوتی پہچان نہ سکیں۔ حالانکہ ہمارے دایاں پیر اپنے بائیں پیر تک کی جوتی بھی پہچان لیتا ہے۔ اور اپنی جوتی تو فوراً ہی معلوم کر لیتا ہے۔ چوتھا[4] وہ اندھا جو پان بناتے وقت کتھّہ کی کُلھیا میں چونے کی اور چونے کی کُلھیا میں کتھّے کی چمچی ڈال دیتا ہے۔ اور پانچواں[5] اندھا جو باوجود دیکھنے اور جاننے بوجھنے کے بیت الخلاء میں بیٹھ کر بجائے کُھڈی کے یا اندر کی بالٹی کے قدمچہ کے اُوپر پاخانہ کر دیتا ہے۔

## (42) مختلف صحتیں

ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ ایک لڑکا پندرہ سولہ سال کا اپنے باپ کے ہمراہ شفاخانہ میں کسی گاؤں سے پیدل چلتا ہُوا آیا۔ اُس کے پیٹ پر ایک نہایت غلیظ اور گندہ کپڑا بندھا تھا۔ مَیں نے پوچھا:- ''کیا ہے''۔ کہنے لگا ''سُور نے اپنی لات مار کر میرا پیٹ تین دِن ہوئے پھاڑ دیا ہے۔ مَیں جنگل میں بکریاں چرا رہا تھا جب یہ حادثہ ہوا''۔

مَیں نے پٹی کُھلوائی تو اندر بھیڑ کی مینگنیاں اور نمدہ کے ٹکڑے بطور پُلٹس زخم پر بندھے ہوئے تھے۔ اور بدبو کے مارے پاس کھڑا ہونا مشکل تھا۔ بڑی مشکل سے زخم صاف کیا گیا۔ تو معلوم ہُوا کہ پیٹ چار انچ پھٹ کر اُس میں سے انتڑیاں اور پھیپر باہر نکلا ہُوا ہے۔ مَیں نے لڑکے کو بے ہوش کر کے جس قدر پھیپر باہر تھا کاٹ دیا۔ اور انتڑیاں نمک کے پانی سے اچھی طرح دھوکر واپس اندر داخل کر دیں۔ پھر زخم کو سی دیا۔ ایک ہفتہ بعد ٹانکے کاٹ دیے گئے اور لڑکا بغیر کسی تکلیف یا بُخار کے اچھا ہوگیا۔ برابر سوکھی روٹیاں اور گُڑ کھاتا رہا۔ اگر کوئی شہری آدمی ہوتا تو پہلے ہلّے میں ہی اُڑ جاتا یہ ہے صحت جنگلی لوگوں کی۔

اسی طرح ایک چُوہڑا جو نقب زنی کر رہا تھا عین موقعہ پر پکڑا گیا۔ گاؤں والوں نے اُسے اتنا پیٹا کہ کوئی ہڈی جسم کی سلامت نہ رہی دونوں ہاتھوں، باہوں اور بازوؤں کی ہڈیاں شکستہ ہوگئیں اسی طرح دونوں ٹانگیں بھی چُور چُور تھیں۔ کئی پسلیاں ٹوٹ گئی تھیں۔ نیچے کا جبڑا شکستہ تھا۔ اور سر پر بھی دو یا تین فریکچر تھے۔ مگر دو ماہ بعد یہی شخص شفا پا کر گھوڑے کی طرح دوڑتا ہُوا اپنے گھر چلا گیا۔ یہ ہے دیہاتی لوگوں کی صحت۔ برخلاف اس کے لاہور میو



ہاسپٹل میں ایک شخص آیا جس کے دائیں پپوٹے پر ذرا سی خراش لگ گئی تھی پھر ورم ہوگیا۔ پھر سر درد اور بخار اور بعد میں سرسام ہوکر دماغ کے پردوں میں پیپ پڑ گئی۔ ابتداء میں جب اسے ہوش تھا تو اُس نے ہم سے پوچھا کہ ''یہ کیا بیماری ہے''؟ کسی طالب علم نے کہہ دیا کہ ''انفلامیشن ہے''۔ اس کے بعد ہوش ہو یا بے ہوشی اس کے منہ سے یہی لفظ نکلتا رہا۔ اور آخر مرتے وقت بھی اُس کے منہ پہ یہ تھا ''انفلا فلا فلا انفلا فلامیشن''۔ یہ ہے صحت شہر والوں کی۔

## (43) لینے کے دینے

میں ایک سرحدی ضلع میں متعین تھا۔ وہاں ایک تُمن یعنی بلوچی جاگیر میں مسجد کا مُلّا اک صبح کو رفع حاجت کے لئے جنگل میں گیا۔ اس علاقہ میں جھاؤ جس سے ٹوکریاں بنائی جاتی ہیں بکثرت ہوتا ہے۔ وہاں بیٹھے بیٹھے اُس نے دیکھا کہ ایک رئیس کسی شخص کے ساتھ باتیں کرتا ہُوا پاس سے گزر رہا ہے۔ جھاڑیاں بہت گھنی تھیں جس میں سے مُلّا نے تو ان دونوں کو دیکھ لیا مگر مُلّا کو کسی نے نہ دیکھا کہ اتنے میں اُس سردار نے اپنی تلوار نکال کر دوسرے ساتھی کی گردن پر ماری اور اُسے قتل کر دیا۔ پھر زمین کی مٹی سرکا کر وہیں اُسے دبا بھی دیا۔ یہ سین دیکھ کر مُلّا خاموشی کے ساتھ وہاں سے چلا آیا۔ مگر ڈر کے مارے کسی سے کہہ نہ سکتا تھا۔ آخر مجبور ہوگیا اور ایک خط غالباً کمشنر صاحب کو بصیغہ راز لکھا کہ ''مَیں نے اپنی آنکھوں سے یہ واقعہ دیکھا ہے۔ اور فلاں جگہ آپ خود نعش نکلوا کر دیکھ سکتے ہیں''۔

کمشنر نے ضابطہ کے طور پر وہ خط ڈپٹی کمشنر کو اور اُس نے پولیس کو بھیج دیا۔ پولیس نے جب مقام معلوم کو کھودا تو مقتول کی نعش گردن کٹی ہوئی نکل آئی۔ اس بات کی اطلاع قاتل کو بھی پہنچ گئی۔ اُس نے اُسی وقت اس

بات کا پتہ لگانا شروع کیا کہ میرے متعلق رپورٹ کس نے کی ہے؟ کیونکہ دیکھنے والا تو کوئی تھا نہیں۔ آخر دفتروں اور کچہریوں سے کسی مخبر کی معرفت یہ پتہ لگ گیا کہ آپ کی مسجد کے مُلّا صاحب ہی کی یہ کارستانی ہے۔ اور خط پر اُسی کا نام ہے۔ پھر تو رئیس نے فوراً کئی چشمِ دید گواہ قتل کے کھڑے کر دیئے۔ جنہوں نے بیان دیا کہ ہمارے سامنے ان مُلّا صاحب نے جنگل میں یہ قتل کیا ہے۔ مقدمہ ابتدائی عدالت میں گیا۔ پھر سیشن میں اور بالآخر عدالت عالیہ میں مگر خون مُلّا جی پر ہی ثابت رہا۔ سب گواہ بڑے پختہ تھے۔ آخر مُلّا صاحب کو پھانسی ملی۔ کسی نے اُن سے پوچھا ''مُلّا جی یہ کیا اندھیر ہے''؟ تو کہنے لگے بات یہ ہے کہ جوانی میں مَیں نے بھی ایک قتل کیا تھا جو اب تک مخفی رہا تھا۔ یہ اُسی کا بدلہ ہے''۔ مثل مشہور ہے کہ ''خدا کے ہاں دیر ہے اندھیر نہیں''۔

## (44) گِدھوں نے گھیر لیا

رہتک کے ضلع کے کسی گاؤں کا ذکر ہے کہ وہاں ایک آدمی نے قریب کے تھانہ میں رپورٹ کی کہ ''ہمارے علاقہ کے جنگل میں ایک آدمی مرا پڑا ہے۔ مَیں نے راستہ سے ذرا ہٹ کر اُس کی لاش دیکھی ہے۔ ممکن ہے کہ قتل کی واردات ہو''۔ اس پر تھانہ دار نے ایک کانسٹیبل کو دریافتِ حال اور تفتیش کے لئے اُدھر روانہ کر دیا۔ جب شام کو رپورٹر وہاں سے گزرا تھا تو لاش کے پاس کوئی جانور نہ تھا۔ مگر جب کانسٹیبل وہاں پہنچا تو صبح کو بہت سے گدھ نعش کے نزدیک جمع ہو چکے تھے۔ سپاہی نے اُس کے پاس پہنچنے کی کوشش کی مگر گدھوں نے پہنچنے نہ دیا بلکہ حملہ کر کے ہر دفعہ اُسے ہٹا دیا۔ آخر دوپہر کے قریب ان گدھوں نے سپاہی کو بھی اپنے نرغہ میں لے لیا۔ جس میں سے باوجود سخت کوشش کے وہ باہر نہ نکل سکا۔ ذرا وہ سپاہی اپنی جگہ سے ہلا اور گدھوں نے



اُس پر حملہ شروع کر دیا۔ اتفاقاً ایک مسافر دُور راستہ پر سے گزر رہا تھا اُس کے ہاتھ کانسٹیبل نے تھانہ میں پیغام بھیجا کہ مَیں یہاں محصور ہو گیا ہوں۔ اور میری زندگی خطرہ میں ہے تھانہ سے فوراً مدد بھیجی جائے۔ اس پر تھانہ سے پولیس کے بہت سے سپاہی بندوقوں سے مسلح ہو کر آئے اور باقاعدہ فائرنگ شروع ہوا۔ بہت سے گدھ مارے گئے اور بہت سے زخمی ہوئے۔ تب جا کر کہیں بڑی مشکل سے اُس سپاہی کو خلاصی ملی۔

گدھ عموماً انسانوں پر حملہ نہیں کرتے۔ اس لئے یہ امر بالکل غیر معمولی تھا۔ اور محاصرہ کر لینا تو ایک عجیب سی بات تھی۔ حتیٰ کہ مسلح پولیس کی امداد سے اس کانسٹیبل کی جان بچی۔ یہ اب یاد نہیں رہا کہ اُس نعش کی موت کا کیا باعث تھا۔

## (45) آہِ مظلوماں کا اثر

عموماً ہندوؤں میں شادی پر بہت روپیہ خرچ ہوتا ہے۔ دہلی کے مضافات میں ایک ڈاکٹر صاحب تھے اُن کے شفاخانہ کے پاس ہی برہمنوں کی گلی میں ایک غریب برہمن کے ہاں لڑکے کی شادی قرار پائی۔ کئی ہزار روپیہ اُن لوگوں نے ایک لڑکی حاصل کرنے میں خرچ کیا۔ کھوکھلے تو تھے ہی اور زیادہ مفلس ہو گئے۔ دلہن خاصے متمول گھرانے کی تھی اور پھر ناز پروردہ۔ سسرال میں دِن کے دس (10) بجے چنگی بھلی آئی اور شام کو بے ہوش ہو گئی۔ ان غریب پنڈتوں نے کبھی ایسی بات دیکھی نہ تھی۔ سخت گھبرا گئے۔ ڈاکٹر صاحب چونکہ نزدیک ہی رہتے تھے فوراً اُنہیں بُلا لائے۔ وہ ابھی معائنہ ہی کر رہے تھے کہ ساس سسر رونے پیٹنے لگے۔ اور بار بار ڈاکٹر صاحب سے پوچھتے تھے کہ ''بہو بچ تو جائے گی؟ لڑکی کی کوئی امید بھی ہے یا نہیں ڈاکٹر صاحب ہم سے

چھپایئے نہیں۔ ہائے اس لڑکی کے پیچھے لٹ گئے تھے۔ اب یہ بھی ہاتھ سے جاتی ہے''۔ ڈاکٹر صاحب نے ٹھوک بجا کر دلہن کو خوب دیکھا پھر نہایت متفکرانہ انداز میں فرمایا کہ ''بظاہر تو کوئی امید بچنے کی نہیں''۔ بڑا پنڈت ان کے پیروں پر گر پڑا کہ ''جس طرح بھی ہوسکے اسے بچاؤ جو مانگو گے وہ دوں گا''۔ آخر سوچ سوچ کر بہت دیر میں انہوں نے فرمایا کہ ''اچھا مجھ سے ٹھیکہ کر لو کوشش کرتا ہوں۔ اگر نہ بچی تو تم سے کوڑی تک لینا حرام ہے۔ اور اگر پرمیشر کی کرپا سے دُلہن اچھی ہوگئی تو پانچ سو روپیہ لوں گا''۔ پنڈت نے فوراً مان لیا۔ کیونکہ اُس کی نظر میں تو وہ مُردہ ہی تھی۔ اور سچ مچ مرجاتی تو پھر کئی ہزار روپیہ میں بھی نئی دلہن ملنی مشکل تھی۔ بلکہ قریباً ناممکن۔

غرض علاج شروع ہوا۔ ایک ٹیکہ دوسرا ٹیکہ تیسرا ٹیکہ مالش اور کئی ظاہرداری کے فضول علاج آخر میں ایمونیا کارب سنگھایا گیا جس پر دلہن نے کلبلانا شروع کیا۔ مبارک سلامت کا شور برپا ہوگیا۔ پھر مزید معالجات ہوتے رہے حتّٰی کہ دو گھنٹہ میں لڑکی نے آنکھیں کھول دیں۔ اور اُس کے آدھ گھنٹہ بعد اُٹھ کر بیٹھ گئی۔ پھر کیا تھا ڈاکٹر صاحب پانچ سو روپیہ کے نوٹ جیب میں ڈال کر وہاں سے ملے اور اُن کی کرامات کا ڈنکا رات بھر اُسے شہر کی گلی گلی اور گھر گھر بجتا رہا۔ برادری نے بھی کہا کہ ''چلو روپیہ ہاتھ کی میل ہے۔ جمتوت گھر میں گھس آئے تھے دفع ہوگئے''۔

غرض شب زفاف بخیریت گزری۔ دوسرے دِن تیسرے پہر کا وقت تھا کہ دلہن کی حالت پھر ویسی ہی ہوگئی۔ ارے لینا بھاگنا دوڑنا یہ کیا ہُوا ہم تو سمجھے تھے اچھی ہوگئی۔ اتنے میں کوئی شخص لڑکی کے میکے کے شہر کا اُدھر سے گزرا اُس نے بتلایا کہ ''اس چھوکری کو تو دو تین برس سے ہسٹیریا کے دَورے پڑتے ہیں اور اکثر شام کے قریب یہ بے ہوش ہو جایا کرتی ہے۔ جبھی تو لڑکی والوں



نے تمہیں اس کا دان دیا ہے۔ ورنہ شہر کے شہر میں کیا اُن کی ٹکر کے رشتے نہ تھے؟ ایک آدمی یہ بات سُن کر بازار میں سے ایک پرائیوٹ ڈاکٹر کو بلا لایا اُس نے بھی دیکھ کر کہا کہ ''ہسٹیریا کا دورہ ہے معمولی بات ہے''۔ اُس نے تولیہ گیلا کر کے کئی بار منہ پر مارا اور ایمونیا کارب سُنگھایا دورہ جاتا رہا۔ اس کے بعد اس گھر میں اُن پانچ سو روپوں کا ماتم برپا ہوا۔

پنڈت جی سیدھے شفا خانہ پہنچے اور ڈاکٹر صاحب سے جا کر لڑنے لگے کہ ''آپ نے مجھ غریب کو لوٹ کر اور دھوکا دے کر بڑا پاپ مول لیا ہے۔ ارے ظالم! برہمن کو تو چھوڑ دیا ہوتا۔ ہندو ہو کر برہمن کے ساتھ یہ فریب''؟ مگر ڈاکٹر صاحب کا ایک ہی جواب تھا کہ ''بھائی وقت کا علاج اور وقت کی کمائی ہے۔ روپیہ زبردستی نہیں لیا۔ بلکہ تمہاری مرضی سے سارا معاملہ طے ہُوا تھا۔ اب اگر تمہیں چارہ جوئی کرنی ہے تو عدالت میں جاؤ''۔ بچارہ پنڈت رو پیٹ کر چلا آیا۔ اور کہنے لگا ''ڈاکٹر صاحب آپ کے پاس یہ پانچ سو روپیہ زیادہ دیر تک نہیں چلے گا۔ مگر ہم غریبوں کے سراپ (بد دُعائیں) جو دِل سے نکلیں گے وہ آپ کا پیچھا نہیں چھوڑیں گے''۔

ڈاکٹر صاحب کی بیوی بڑی نیک دِل تھی۔ وہ اپنے پتی سے کہنے لگی کہ ''برہمن مہاراج کا روپیہ واپس کر دیں۔ دھوکہ کا پھل اچھا نہیں ہوتا پرمیشر کو برہمن دیوتا کا ستانا بہت ناگوار گزرے گا''۔ مگر ڈاکٹر صاحب نے ڈانٹ ڈپٹ کر اُسے بھی خاموش کر دیا۔

ابھی کچھ زیادہ دِن نہیں گزرے تھے کہ ڈاکٹر صاحب کی آنکھیں دُکھنے آ گئیں پہلے تو معمولی بیماری سمجھی گئی۔ پھر تو یہ حال ہُوا کہ درد اور ٹیسیں سرخی اور پانی حتّٰی کہ زخم بڑھنے شروع ہو گئے۔ مجبوراً شفاخانہ میں داخل ہوئے۔ وہاں کے معالج نے بھی بہت تشویش ظاہر کی۔ اور باوجود بہترین علاج

کے آنکھوں کی تکلیف بڑھتی ہی چلی گئی۔ یہاں تک کہ اندھا ہونے کا خطرہ پیدا ہو گیا۔ بچاری بیوی ان کو بار بار یاد دلاتی تھی کہ ''یہ بیماری نہیں ہے۔ اُس پنڈت غریب کی آہ مظلوماں ہے''۔ مگر ڈاکٹر صاحب اس کی بات کو جہالت کہہ کر ٹال دیتے تھے۔ لیکن جب واقعی نابینا، ہونے کے آثار سامنے آ گئے تو بمشکل انہوں نے بیوی کے اصرار پر اُسے اجازت دی کہ روپیہ واپس کر دیا جائے۔ روپیہ کا واپس ہونا تھا کہ ڈاکٹر صاحب اچھے ہونے شروع ہو گئے اور ایک ماہ دِلّی میں گزار کر پورے تندرست ہو کر گھر واپس آ گئے۔

## (46) کفن چور مُلّانے

عموماً میونسپل کمیٹیاں لاوارث مُردوں کو اپنے خرچ پر دفن کراتی ہیں۔ اور مقامی ہندوؤں کی کمیٹی اور مسلمانوں کی انجمن سے ٹھیکہ کر لیتی ہیں کہ مُردہ کو وہی جلائیں یا دَفن کریں۔ اور کمیٹی سے مقررّہ اخراجات لے لیا کریں۔

1919ء کا ذکر ہے کہ مَیں پانی پت میں متعیّن تھا۔ جہاں کی انجمن لاوارث مُردے مسجد کے مُلّانوں سے دفن کرا دیا کرتی تھی۔ اور میونسپل کمیٹی سے دس روپیہ لے لیا کرتی تھی۔ مگر وہ دس روپے انجمن کے کام نہیں آتے تھے۔ انجمن کا تو صرف انتظام ہی تھا۔ روپے اُنہیں مُلّانوں کو دے دیے جاتے تھے تاکہ وہ کفن، غُسل، مُردہ کو لے جانا، قبر کھودنا اور دفن کرنا سب اس رقم میں پورا کر دیا کریں۔ اُن دنوں یہ تخمینہ ٹھیک تھا۔

ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ پولیس کسی لاوارث مقتول کو پوسٹ مارٹم کے لئے میرے پاس لائی۔ میں نے بعد ملاحظہ نتیجہ لکھا کہ ''اس شخص کے سر پر لاٹھیاں مار کر اسے قتل کیا گیا ہے''۔

اب مشکل یہ آ پڑی کہ نعش جنگل میں پڑی ہوئی ملی تھی۔ اور کسی نے



اس کی شناخت نہیں کی تھی کہ کس شخص کی ہے؟ اس وجہ سے مقدمہ ملتوی رہا۔

نعش بعد ملاحظہ مقامی انجمن کے کارندوں یا یوں کہیے کہ مسجد کے مُلّانوں کے سپرد کر دی گئی۔ اور کمیٹی نے دس روپیہ اُن کے حوالے کر دیے مُلّانوں نے رپورٹ کر دی کہ مُردہ گورِ غریباں میں دفن کر دیا گیا۔ آٹھ دس دِن کے بعد جہاں سے نعش ملی تھی وہاں سے پانچ سات کوس کے فاصلہ پر ایک گاؤں کی کسی عورت نے پولیس میں رپٹ لکھوائی کہ ''میرا خاوند کئی دِن سے گم ہے اور اُس کا کچھ پتہ نہیں چلتا''۔ تھانیدار کو خیال آیا کہ کہیں وہ غیر شناخت شدہ نعش اس عورت کے خاوند کی ہی نہ ہو۔

جھٹ افسران بالا کو رپورٹ کر کے قبر کُھدوانے اور نعش شناخت کرانے کی اجازت لے لی۔ نتیجہ یہ ہُوا کہ میری اور تحصیلدار صاحب کی موجودگی میں وہ قبر کھودی گئی اور نعش کو شناخت کے لئے باہر نکالا گیا۔ لیکن آپ یہ معلوم کر کے حیران ہوں گے کہ اُن ظالم مُلّانوں نے جو دس (10) روپے لے کر مُردہ کے کفن دفن کے ذِمّہ دار تھے ایک پیسہ اس کام پر خرچ نہیں کیا تھا۔ مُردہ بالکل الف ننگا اور قطعاً برہنہ قبر میں اوندھا پڑا تھا۔ غالباً قبر کے کنارے پر رکھ کر اسے اندر اس طرح لڑھکایا تھا کہ نعش منہ کے بَل جا پڑی تھی نہ لحد تھی نہ اینٹیں تھیں۔ نہ قبر ہی گہری تھی۔ قبر کی جگہ ریتلی زمین تھی پس ذرا سا کھودنے پر وہاں آسانی سے قبر تیار ہو گئی۔ رقم سب غائب اور مُلّانوں کے ہاتھ مسلمان مُردہ کی مٹی یوں پلید!

اُس زمانہ میں اُن دس (10) روپوں کا حساب قریباً یوں ہُوا کرتا تھا قبر کُھدوائی دو روپیہ، کفن چار روپیہ، غسل کرائی ایک روپیہ، مٹی کے دو لوٹے ایک آنہ، دو گھڑے، تین آنہ جنازہ اُٹھوائی، نماز پڑھوائی، چار مُلّانوں کے لئے دو روپیہ، متفرقات بارہ آنے میزان کل دس روپے۔

# (47) غیبی امداد

1915ء میں میرا تبادلہ جالندھر سے پانی پت کا ہوگیا۔ اسباب مال گاڑی میں چلا گیا تھا۔ اب معمولی پیکنگ ساتھ والے سامان کا ہو رہا تھا اور مَیں دس (10) بجے دِن کے اکیلا اپنے مردانہ برآمدہ میں ایک بکس میں کیلیں ٹھونک رہا تھا کہ ایک نوجوان لالہ صاحب جن سے مَیں قطعاً ناواقف تھا سلام کر کے میرے پاس آ کھڑے ہوئے۔

لالہ:- مہاراج مجھے کچھ تکلیف ہے۔

مَیں:- بھئی مَیں تو آج ہی شام کی گاڑی سے اس شہر سے جا رہا ہوں آپ کسی اور ڈاکٹر کی طرف رُجوع کریں۔

لالہ:- یہ تو میں بھی سُن چکا ہوں۔ آپ علاج نہیں کر سکتے تو صرف مشورہ ہی دے دیجئے۔ یہ کہہ کر اُس نے پانچ روپیہ کا نوٹ میرے سامنے والے بکس پر رکھ دیا۔

مَیں:- مشورہ بھی کسی مقامی ڈاکٹر سے لینا ہی مناسب ہوگا۔ آپ ناحق کی تکلیف نہ کریں اور یہ نوٹ اُٹھائیں۔

لالہ:- (ایک نوٹ پانچ روپیہ کا اور سامنے رکھ دیا) اُن سے بھی مشورہ لے لوں گا۔ مگر آپ بھی اگر مجھے صحیح رستہ پر ڈال دیں تو کیا ہرج ہے۔

مَیں:- مَیں نہیں سمجھ سکتا کہ اتنی جلدی میں مَیں کیا مشورہ دے سکتا ہوں اور آپ کس بات کے متعلق مشورہ مانگتے ہیں؟

لالہ:- ایک اور نوٹ سامنے رکھ کر مجھے ایک تکلیف ہے۔

مَیں:- کیا؟

لالہ:- ایک دوسرا نوٹ آگے رکھ کر میرے پیٹ کے دائیں طرف



نیچے کو چلتے پھرتے ایک گولہ سا اُبھرتا ہے۔

مَیں:- دکھایئے۔

لالہ:- ایک پانچ روپے رکھ کر یہ ہے وہ گولہ۔

مَیں:- ذرا کھانسئے زور سے۔

اس پر لالہ صاحب پانچ روپے کا ایک اور نوٹ سامنے رکھ کر زور سے کھانسنے لگے۔

مَیں:- کیا جب آپ لیٹتے ہیں تو یہ گولہ دَب کر غائب ہو جاتا ہے؟

لالہ:- (ایک اور پنجہ رکھ کر) ہاں اس وقت بالکل غائب ہو جاتا ہے۔

مَیں:- میرے نزدیک آپ کو فتق ہے۔

لالہ:- (پانچ روپے رکھ کر) فتق کیا؟

مَیں:- جسے انگریزی میں ہرنیا کہتے ہیں۔

لالہ:- (پانچ روپیہ پیش کر کے) مَیں ہرنیا بھی نہیں سمجھا۔

مَیں:- آپ کے ہاں غالباً اسے نَل اُترنا کہتے ہیں۔

لالہ:- (پانچ روپیہ اور رکھ کر) سُنا تو ہے مگر سمجھا نہیں۔

مَیں:- انتڑی پیٹ کے باہر اُترنے لگتی ہے۔

لالہ:- (پھر پانچ روپیہ پیش کر کے) تو یہ انتڑی ہے؟

مَیں:- ہاں انتڑی ہے۔ جبھی تو گڑگڑ کرتی اُترتی اور چڑھتی ہے۔

لالہ:- (پانچ روپیہ کے ساتھ) پھر اب اسے کیا کروں؟

مَیں:- مناسب ہوگا کہ آپ اس کا آپریشن کرا لیں۔

لالہ:- (بمعہ پانچ روپیہ) ہیں آپریشن؟

مَیں:- جی ہاں آپ کا علاج تو آپریشن ہی ہے۔

لالہ:- (پانچ روپیہ رکھ کر) تو کیا کوئی کچّا علاج بھی ہے؟

مَیں :- ہاں ایک پیٹی ہوتی ہے جسے ہر وقت باندھے پھرنا پڑتا ہے۔

لالہ:- (پانچ روپے رکھ کر) اس سے کچھ تکلیف تو نہیں ہوتی؟

مَیں:- اس کے ساتھ کچھ زیادہ اہتمام کرنا پڑتا ہے۔ اور گرمیوں میں پسینہ سے بھی خراب ہوتی رہتی ہے۔

لالہ:- (پانچ روپے رکھ کر) پھر کیا کیا جائے؟

مَیں: اور میرے نزدیک تو پکا علاج آپریشن ہی ہے آپ جوان آدمی ہیں پیٹی کا بڑا جھگڑا ہے۔

لالہ:- (پانچ روپے مزید دے کر) تو آپریشن کرا لوں نا یہی مناسب ہوگا؟

مَیں:- میرا تو یہی مشورہ ہے۔

لالہ:- (پانچ روپے کا نوٹ) کیا کلورافارم بھی لینا پڑے گا؟

مَیں:- ہاں وہ تو لازمی ہے۔

لالہ:- (پانچ روپے رکھ کر) اُس کا خطرہ تو کوئی نہیں؟

مَیں: - نہیں کوئی ایسا خطرہ تو نہیں ہے۔ آپ تندرست آدمی معلوم ہوتے ہیں۔ میرے نزدیک تو یہی مناسب ہوگا۔

لالہ: - (پانچ روپے کے ساتھ) بہت بہت شکریّہ بس میں یہی مشورہ آپ سے لینے آیا تھا۔

مَیں: - لالہ صاحب یہ روپے تو اُٹھا لیجئے مَیں کس طرح اتنی رقم اس مشورہ کی لے سکتا ہوں؟

مگر لالہ اتنی دیر میں کہیں کا کہیں جا چکا تھا۔ پیٹھ پھیرتے ہی ہُوا ہوگیا۔ خدا جانے فرشتہ تھا جو مجھے سفر کے اخراجات دینے آیا تھا۔ یا کوئی



جن تھا میں نے نوٹ اُٹھا کر گنے تو بیس (20) یعنی پورے سو (100) روپے مگر اصل عقدہ آج تک نہیں کھلا۔

## (48) دودھ گھی کی نہریں

جب چیزوں کے نرخ مہنگے تھے تو لوگوں کے باغیانہ خیالات بھڑکانے کے لئے مہاشہ صاحبان کہا کرتے تھے کہ ”ایک پراچین زمانہ وہ تھا جب ہندوستان میں دُودھ اور گھی کی نہریں چلا کرتی تھیں۔ اناج کی نہایت ارزانی تھی۔ لوگ طاقتور تھے۔ ان انگریزوں کے آنے سے ہر چیز مہنگی ہوگئی۔ اور ہندوستانی بھوکے مرنے لگے“ وغیرہ وغیرہ۔ پھر 1930ء سے ارزانی کا ایک دور شروع ہُوا دُودھ شہروں میں ایک آنہ سیر اور غلہ ایک روپیہ کا بیس سیر جا پہنچا۔ تو جھٹ دُوسرا راگ الاپنا شروع کر دیا کہ ”ملک فنا ہوگیا۔ تاجر تباہ ہو گیا۔ زمیندار بُھوکا مر گیا“۔

آخر ایک دِن ایک مہاشہ صاحب سے جو ایسی باتیں کہہ رہے تھے۔ مَیں نے کہا: کہ تمہیں تو نہ یوں چین ہے نہ ووں۔ ابھی تو دُودھ گھی کی نہریں نہیں بہیں۔ ذرا سماں سستا ہی ہُوا ہے۔ تو لگے تم چیخنے۔ اگر نہریں چلنے لگیں تو شاید خودکشی ہی کر لو گے۔ فرمانے لگے ”اجی یہ سب پراپیگنڈا ہوتا ہے ورنہ بھاؤ تو پرمیشر کے ہاتھ میں ہی ہے۔ ہم ایسی دلیلیں بھی نہ دیں تو لوگوں کو کس طرح اپنا ہم خیال بنائیں۔ سیاست جُھوٹ اور فریب کا دوسرا نام ہے اور بس“۔

## (49) ایک مولانا

1916ء کا ذکر ہے کہ پانی پت میں سخت ہیضہ پھوٹا اور سارے کنوؤں میں لال دوا ڈالنی ضروری ہوگئی۔ کمیٹی کے رجسٹروں سے معلوم ہُوا کہ

شہر میں ڈیڑھ سو کُنواں ہے ہم نے ایک رات شہر کے ڈاکٹروں، نمبرداروں، ملازمین سرکاری اور پبلک کی مِلا کر چار پارٹیاں بنائیں اور یہ انتظام کیا کہ کوئی کُنواں ایسا نہ رہے جس میں لال دوائی نہ پڑے چنانچہ شام سے صبح تک کنوؤں میں دوائی پڑتی رہی۔ مگر حساب کرنے پر صبح معلوم ہُوا کہ شہر میں سات سو (700) کُنواں ہے نہ کہ ڈیڑھ سو۔ خیر ایک کُنواں رات کو کسی دوسری پارٹی کے حِصّہ کا رہ گیا تھا۔ اور رپورٹ یہ ملی تھی کہ مولانا.......... نے دوا ڈلوانے سے انکار کر دیا ہے۔ دوسرے دِن میں خود اُن کے مکان پر پہنچا معلوم ہُوا کہ اُن کی حویلی بڑی عالی شان ہے۔ کُنواں صحن کے بیچ میں تھا اس لئے اطلاع کرائی۔ مولانا کمال شائستہ صورت، نہایت گھنی اور لمبی ڈاڑھی کے ساتھ ایک جنگلی عمامہ زیب سر کئے ہوئے باہر تشریف لائے۔ مگر کندھے پر ایک پھاوڑہ بھی تھا مَیں نے دیکھتے ہی خیال کیا کہ شاید اس آلۂ حرب سے وہ مجھے قتل کریں گے۔ مَیں نے نہایت ادب سے کہا ''مولانا دیکھئے شہر میں کیا موتا موتی لگ رہی ہے۔ سات سو میں سے صرف آپ کا ایک کُنواں بغیر دوا کے رہ گیا ہے۔ مہربانی فرما کر اس میں دوا ڈلوا لیں۔ فرمایئے اجازت ہے''؟

مولانا فرمانے لگے ''ڈاکٹر صاحب آپ جانتے ہیں کہ مَیں حکیم بھی ہوں۔ اور ایک پختہ عقل، تجربہ کار اور معمر انسان ہوں میرا تو یہ تجربہ ہے کہ جب سے یہ زہریلی دوائیں کنوؤں میں پڑنی شروع ہوئی ہیں تب سے ہی سارے شہر میں جریان کا مرض وبا کی طرح پھیل گیا ہے۔ اور آدھا شہر نامرد ہو چکا ہے۔ یقین مانئے اگر آپ نے زبردستی میرے گھر کے کنویں میں دوا ڈال دی تو اسی پھاوڑے سے اپنی حویلی ڈھانا شروع کر دوں گا۔ اور اس کی اینٹ سے اینٹ بجا دوں گا''۔

اُس وقت مجھے معلوم ہُوا کہ یہ پھاوڑہ میرے قتل سے بھی زیادہ



خوفناک کام کے لئے استعمال ہونے کے واسطے آیا ہے۔ مَیں نے اُن کو سلام کی اور شکست کھا کر چُپکا چلا آیا کیونکہ بعض صورتوں میں باعزت واپسی فتح سے زیادہ بہتر ہوتی ہے۔

## (50) حاملہ مرد

جب میں سرسہ میں متعیّن تھا تو ایک دِن ایک شخص تقریباً تیں پینتیس سال کا بظاہر خاصہ سمجھدار میرے پاس شفاخانہ میں آیا۔ اور کہنے لگا کہ ''مَیں دُور سے آپ کی شہرت سُن کر اپنے علاج کے لئے آیا ہوں۔ مجھے دیکھ لیں''۔ مَیں نے کہا: ''کیا بات ہے''؟ کہنے لگا ''اندر کمرے میں لٹا کر دیکھیں''۔ مَیں نے کہا ''اندر ہی دیکھ لوں گا۔ مگر تکلیف کیا ہے''؟ کہنے لگا ''مجھے حمل ہے اس لئے اندر چل کر اچھی طرح ملاحظہ کریں''۔ مجھے بے اختیار ہنسی آ گئی اور مَیں نے اُسے مراق کا نسخہ لکھ دیا۔ مگر وہ یہی کہتا رہا کہ ''مجھے تو اپنا حمل دکھانا ہے''۔ آخر مَیں نے اُسے لٹا کر بھی دیکھا بات ہی بیہودہ تھی۔ دیکھ کر بھی جب میری رائے اس سے متفق نہ ہوئی تو یہ کہہ کر چلا گیا کہ ''دُور کے ڈھول سہاونے''۔

بہت شور سنتے تھے پہلو میں دِل کا
جو چیرا تو اک قطرہ خوں نہ نکلا

## (51) عہد کا پکا مگر مجبور

مَیں گوجرہ ضلع لائلپور میں 1925ء میں تھا کہ ایک رات دس بجے کے قریب پولیس ایک معزز سکھ کو چارپائی پر ڈال کر ریلوے اسٹیشن سے اُتار کر شفاخانہ میں لائی۔ اس کے ہمراہ اور کوئی آدمی نہ تھا۔ اس کا قصہ یوں بیان کیا

گیا کہ آج یہ لائلپور کی کچہری سے ایک مقدمہ میں فتح یاب ہو کر نکلا تو اس نے لائلپور کے ریفرشمنٹ روم میں خوب شراب پی۔ اس کے گاؤں کے کئی آدمی بھی اس کے ہمراہ تھے۔ اُن کو بھی پلائی۔ پھر کئی بوتلیں شراب کی خرید کر یہ شخص مع اپنے ہمراہیوں کے ریل میں بیٹھ گیا۔ ٹوبہ ٹیک سنگھ تک کے لئے اُن کے ٹکٹ تھے۔ ریل میں ان سب لوگوں نے مقدمہ کی فتح کی خوشی میں بوتلیں چڑھائیں۔ خصوصاً اس سکھ نے آخر وہ بے ہوش ہوگیا۔ ریل کے خانہ میں اور مسافر بھی تھے۔ انہوں نے ریلوے پولیس کے کنسٹیبل کو جو ٹرین میں موجود تھا اطلاع دی۔ یہ دیکھ کر اُس کے باقی سب ہمراہی تو کسی درمیانی اسٹیشن پر گاڑی سے اُتر کر بھاگ گئے۔ اور یہ صاحب اکیلے پڑے رہ گئے۔ گوجرہ کے اسٹیشن پر اُن کو بھی پولیس والوں نے اُتار لیا۔ مگر وہ غٹ تھے۔ اس لئے چارپائی پر لاد کر علاج اور معائنہ کے لئے میرے ہاں لائے گئے۔ خیر میں نے اُن کا معدہ دھویا اور ضروری علاج کیا۔ بے حد شراب اندر سے نکلی۔ لیکن جو ہضم ہو چکی تھی وہ بھی اتنی تھی کہ ہوش نہ آیا۔ صرف اتنا اطمینان ہوگیا کہ صبح تک ہوش آجائے گا یہ شخص مرے گا نہیں۔ صبح کو 8 بجے کے قریب جب میں شفاخانہ میں گیا تو دیکھا کہ سردار صاحب اچھے بھلے چارپائی پر بیٹھے ہوئے ہیں۔ اس کے بعد میں دوسرے مریضوں کو دیکھتا رہا۔ گیارہ بجے فارغ ہو کر میں نے اُنہیں بُلایا۔

آدمی قبول صورت، سمجھدار اور معزز معلوم ہوتا تھا۔ میرے گھٹنوں کو ہاتھ لگا کر کہنے لگا کہ ”مَیں شریف ہوں۔ معزّز ہوں سفید پوش ہوں۔ غلطی ہو گئی ہے مجھے پولیس سے اور نئے مقدمہ میں پھنسنے سے بچاؤ۔ کل ہی ایک مقدمہ فتح کر کے آیا ہوں اگر آج پھر حوالات میں چلا گیا تو میری بڑی ذِلّت اور سُبکی ہے“۔ مَیں نے کہا: ”ایک شرط پر“۔ کہنے لگا ”فرماؤ“۔ مَیں نے کہا کہ ”تم صرف اتنا اِقرار کر لو کہ شراب چھوڑ دوں گا“۔ سوچ سوچ کر کہنے لگا۔



”آپ نے بڑا مشکل مطالبہ کیا ہے“۔ مَیں نے کہا: ”اس سے کم میں مَیں تمہاری مدد نہیں کر سکتا“۔ بولا ”اچھا تین گھنٹے سوچنے کے لئے دیں“۔ مَیں نے کہا: ”شام تک سوچ سکتے ہو۔ شراب تم نے پی ہے اور تمہارے معدہ میں سے نکالی گئی ہے۔ میں جھوٹ تو لکھ نہیں سکوں گا۔ مگر حکام سے مِل کر بہر حال تمہاری خلاصی کرا دوں گا انشاء اللہ۔ لیکن صرف اس شرط پر جو مَیں نے تم سے کہی ہے“۔

خیر مَیں گھر چلا گیا۔ تیسرے پہر وہ میرے پاس آیا اور کہنے لگا ”ڈاکٹر صاحب! مَیں نے خوب سوچ لیا۔ یہ شرط میرے اختیار سے باہر ہے۔ اور آپ بھی سچے ہیں۔ اور میں یقین رکھتا ہوں کہ میرے خیرخواہ ہیں لیکن حالات ایسے ہیں کہ میں ایسا اقرار نہیں کر سکتا“۔ مَیں نے کہا: ”کیوں اس میں نقصان اور ہرج کیا ہے“؟ کہنے لگا ”بے شک سراسر میرا ہی فائدہ ہے لیکن ہم لوگوں کی پوزیشن بڑی نازک ہے۔ مجھے شراب کی زیادہ عادت اور لت بھی نہیں ہے۔ اگر عادت ہوتی تو میں بے ہوش ہی کیوں ہوتا نہ رات بھر مدہوش رہتا۔ لیکن عزّت کے لئے ہر کوئی مرتا ہے۔ میں بھی جاٹ کا پوت ہوں۔ اگر شراب سے توبہ کر لوں گا تو قوم اور برادری میں ذلیل سمجھا جاؤں گا۔ لوگ کہیں گے کہ خرچ کے مارے شراب چھوڑ دی۔ برادری میں ’بیاہ شادی‘ میں میلے تہواروں میں اگر سب سے الگ ہو کر رہوں گا تو ناک کٹے گی۔ عزّت کا سوال ہے، عادت کا نہیں۔ آپ جو چاہیں پولیس کو نتیجہ لکھ دیں۔ مگر میں جاٹ کا بیٹا ہوں گا تو وہ کام نہیں کر سکوں گا جو آپ چاہتے ہیں۔ نہ وہ اقرار کروں گا جسے میں پورا نہیں کر سکتا۔ اگر شراب چھوڑ بھی دوں اور یقیناً چھوڑ سکتا ہوں تو پھر بھی یار دوست اور افسر لوگ مجھے توبہ پر قائم نہ رہنے دیں گے“۔

اُس کی تقریر سُن کر میرے دِل میں اُس کے لئے ایک جذبہ عزّت

پیدا ہوا۔ مگر مَیں بھی اپنی بات کا پکّا تھا مجبور ہو کر نتیجہ لکھ دیا کہ ''یہ شخص مخمور اور مدہوش تھا''۔ سپاہی اُس کے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں ڈال کر لے گئے اور میں واقعی اُس وقت اُس کے لئے کڑھ رہا تھا۔

## (52) سڑک کے بُھتنے

مظفر گڑھ کا ذکر ہے اور غالباً 1930ء کا کہ میں اپنی موٹر کار میں دائرہ دین پناہ کے شفا خانہ کا ملاحظہ کرنے گیا۔ واپسی پر ایک جگہ دھم دھم تین چار پتھر موٹر پر دونوں طرف سے آ کر لگے۔ دیکھا تو چار لڑکے تھے۔ دو ایک طرف دو ایک طرف۔ جنہوں نے بڑے بڑے پتھر موٹر پر پھینکے تھے۔ یہاں تک کہ گاڑی پر اُن سے نشان اور چِب بھی پڑ گئے تھے۔ مَیں نے ڈرائیور کو کہا موٹر کار ٹھہراؤ۔ موٹر کو ٹھہرتے دیکھ کر وہ لڑکے بھاگے۔ مَیں نے ڈرائیور اور اردلی دونوں کو اُن کے پیچھے دوڑایا اور کہہ دیا ''کسی ایک کو ضرور پکڑ لانا''۔ یہ غل پہلے بھی سنا ہُوا تھا کہ اس مقام پر کچھ شریر لڑکے جن کی عمریں 12، 14 سال کی ہیں اسی طرح افسران کی موٹروں پر پتھر مار کر بھاگ جایا کرتے ہیں۔ کبھی پکڑے نہیں گئے۔ اور سب موٹر کار والے اُن کی شرارت سے نالاں ہیں۔ خیر جب ڈرائیور اور اردلی اُن کے پیچھے بھاگے تو تین لڑکے تو اِدھر اُدھر ہو گئے۔ مگر ایک سیدھا گاؤں کی طرف گیا جو سامنے آدھ میل پر نظر آ رہا تھا۔ حُسنِ اتفاق سے گاؤں والے اکثر مرد اُس وقت کھیتوں پر تھے۔ اور گاؤں تقریباً خالی پڑا تھا۔ بھاگتے بھاگتے وہ لڑکا گاؤں میں پہنچ کر ایک گھر میں گھس گیا۔ تعاقب کرنے والے بھی پیچھے پیچھے وہاں جا پہنچے۔ ایک عورت اُس مکان میں بیٹھی تھی اُس سے پوچھا تو اُس نے کہا کہ ''یہاں تو کوئی لڑکا نہیں آیا''۔ اندر جا کر دیکھا تو واقعی وہاں کوئی بھی نہ تھا۔ اتنے میں ڈرائیور نے دیکھا کہ تندور پر چھاج ڈھکا ہُوا



ہے۔ اُسے شبہ ہوا۔ چھاج اُٹھایا تو صاحبزادہ صاحب اندر بیٹھے ہوئے نظر آئے۔ کان پکڑ کر باہر کھینچ لیا اور ہاتھ پکڑ کر لے چلا اور کھینچتا ہُوا موٹر تک لے آیا۔ اتنے میں گاؤں کے کچھ مرد اور عورتیں موٹر کے گرد جمع ہو گئے۔ مجھے یہ خوف ہُوا کہ کہیں جھگڑا پیدا نہ ہو۔ چنانچہ مَیں نے لڑکے کو جلدی سے اپنے پاس موٹر میں بٹھا لیا اور ڈرائیور کو چلنے کا اشارہ کیا۔ گاؤں کے جو لوگ جمع ہو گئے تھے اب تک وہ یہی سمجھتے رہے کہ لڑکے کو شاید مار پیٹ کر چھوڑ دیں گے۔ مگر موٹر کو جاتا دیکھ کر انہوں نے یُورش کر دی۔ عورتیں رونے لگیں اور مردوں نے پتھر برسانے شروع کر دیے مگر ہم نے بھی رفتار تیز کر دی اور ہجوم سے آگے نکل آئے لیکن وہ لوگ برابر تعاقب کرتے رہے۔ حتیٰ کہ چار پانچ میل کا فاصلہ طے کر کے ہم بصیرہ کے پولیس اسٹیشن پر پہنچ گئے۔ یہاں آ کر مَیں نے سب انسپکٹر صاحب کو بُلا کر وہ لڑکا جو 12، 14 سال کا تھا اُن کے سپرد کر دیا اور کہہ دیا کہ ''ان لڑکوں نے موٹر کار والوں کی ناک بندی کی ہوئی تھی بلکہ ناک میں دَم کر رکھا تھا۔ آپ خود دیکھ لیں کہ یہ تازہ چار پتھروں کے نشانات میری موٹر پر بھی موجود ہیں۔ آپ اسے ماریں کوٹیں نہیں بلکہ صرف حوالات میں بند کر دیں۔ پیچھے پیچھے اس گاؤں والے اور رشتہ دار مرد عورتیں آ رہے ہیں۔ اصل میں تو اُن کو دھمکانے اور سمجھانے کی ضرورت ہے''۔ تھانہ دار صاحب کہنے لگے کہ ''ان بدمعاشوں کی بہت سی شکایتیں افسرانِ بالا نے اس تھانہ میں بھیجی ہیں۔ مگر پتہ نہ لگتا تھا کہ یہ شیطان کون ہیں اور کس گاؤں کے ہیں۔ بس اب آپ اطمینان رکھئے مَیں سب کو سیدھا کر لوں گا''۔ مَیں تو مظفر گڑھ آ گیا۔ مگر پھر سنا کہ اس سڑک پر اس کے بعد کامل امن ہو گیا۔ اور وہ بھتنے اس واقعہ کے بعد پھر کسی کو نظر نہیں آئے۔

## (53) خدا کی ہستی کا ثبوت

اب تو اکثر شہروں میں بجلی لگ گئی ہے مگر پہلے عموماً اچھی روشنی کے
لئے گول بتی کا لیمپ استعمال ہُوا کرتا تھا۔ میز پر پڑھنے کے لئے بھی اور چھت
پر لٹکانے کے لئے بھی۔ گول بتی، گول شعلہ اور گول چمنی، ان لیمپوں کی
خصوصیت ہُوا کرتی تھی۔ ایک دِن میں شفاخانہ میں بیٹھا ہُوا تھا کہ بارہ بجے
کے قریب ایک لالہ جی اپنی دائیں آنکھ پر رومال رکھے ہوئے تشریف لائے۔
میں نے پوچھا ”کیا ہوا“؟ کہنے لگے کہ ہمارے ہاں گول بتی اور گول چمنی کا
چھت گیر لیمپ ہے۔ رات بھر وہ جلتا ہے اور صبح بجھا دیا جاتا ہے۔ آج بھی
حسبِ معمول صبح کے وقت بجھا دیا گیا۔ مَیں اتفاقاً ابھی آدھ گھنٹہ ہُوا کمرہ میں
اُس کے نیچے کھڑا ہُوا کہ چٹاخ سے کسی چیز کے ٹوٹنے کی آواز سنائی دی۔ مَیں
نے چھت کی طرف دیکھا ہی تھا کہ اتنے میں چاندی کی دوّنی کے برابر ایک ٹکڑا
اس لیمپ کی چمنی میں سے الگ ہوکر سیدھا میری دائیں آنکھ کے اندر لگا۔ مَیں
درد کے مارے بےقرار ہوگیا۔ اور بھاگا ہُوا ہسپتال آیا ہوں“۔ مَیں نے اُن کو
میز پر لٹا کر آنکھ میں کوکین لوشن ڈالا تو کیا دیکھتا ہوں کہ اس شیشہ کے ٹکڑے
کے تیز کنارے سے ان کی آنکھ صاف آدھم آدھ کٹ گئی ہے۔ میں نے آہستہ
سے وہ شیشے کا ٹکڑا جس سے مشیتِ الٰہی نے لالہ جی کی آنکھ کی چاند ماری کی
تھی، زنبور سے پکڑ کر نکال دیا۔ پھر آنکھ پر پٹی باندھ دی۔ مجھے بظاہر کوئی امید
نہ تھی کہ آنکھ بچ جائے گی۔ مگر خدا کا کرنا ایسا ہُوا کہ چند دِن زخم اس طرح اچھا
ہوگیا گویا کبھی لگا ہی نہ تھا۔ لیکن ساتھ ہی آنکھ کی بینائی بھی جاتی رہی۔ کیونکہ
چوٹ کی وجہ سے اُس آنکھ میں موتیا بند پیدا ہوگیا۔ دو ماہ کے مسلسل علاج کے
بعد وہ موتیا بند بھی آہستہ آہستہ جذب ہوگیا اور مریض کو اچھا خاصا نظر آنے لگ



گیا۔ وہ شخص اب بھی زندہ ہے۔ مگر خدائی تقدیر کا نشان دیکھو کہ دِن کو لیمپ
گُل ہونے کے کئی گھنٹے بعد وہ چمنی چٹخی تقدیراً وہ شخص اس کے نیچے کھڑا تھا۔
آواز سُن کر اوپر کو دیکھنا تھا کہ شیشے کا ٹکڑا سیدھا آنکھ کے اندر گھس گیا۔ اور
اُسے دوحصوں میں کاٹ دیا۔ گویا اتفاقی بات نہ تھی بلکہ کسی صاحبِ ارادہ ہستی کا
فعل تھا پھر یہ تماشا دکھا کر اسی ہستی نے مضروب پر رحم فرمایا اور اپنے کئے کو اَن
کیا کر دیا۔ اور اتنا بڑا زخم اچھا ہوگیا۔ مگر آنکھ کی بینائی جاتی رہی کیونکہ ایسے
زخموں کا یہی قدرتی نتیجہ ہُوا کرتا ہے۔ اس کے بعد اُس ہستی نے پھر دوبارہ
اس شخص پر رحم فرمایا اور اس کا موتیا بند اندر ہی اندر ہفتوں میں تحلیل اور جذب
ہوکر صاف ہوگیا اور مریض کو پھر دکھائی دینے لگ گیا۔ قدرت کے ایسے افعال
جن میں خدائی ارادہ، خدائی رحم اور خدائی شفا شامل حال ہوں میں نے بہت
دیکھے اور ساری عمر دیکھتا رہا ہوں۔ اس لئے میں اُس ہستی پر یقین رکھتا ہوں
جسے اللہ کہتے ہیں اور جس پر ایمان لائے بغیر انسان کبھی حقیقی سکھ اور سچی خوشی
حاصل نہیں کرسکتا۔

## (54) سب کے پَیر کاٹو

مُدت ہوئی مَیں جب بلوچستان کی سرحد پر تعینات تھا تو ایک بڈھا
بلوچ میرے پاس پچاس کوس سے آیا۔ اور اُس نے اپنا ایک پَیر مجھے دکھایا۔
جس میں کئی ناسور موجود تھے۔ آتے ہی کہنے لگا کہ ”کئی سال ہوئے یہ چوٹ
لگی تھی پھر پیر پک گیا اور برسوں سے پکتے پکتے یہ ناسور بن گئے ہیں۔ آپ
سے پہلے جو ڈاکٹر تھا میں اُس کے پاس بھی آیا تھا۔ اور جو اُس سے پہلے تھا
اُس کے پاس بھی۔ مگر یہ زخم کسی سے اچھے نہ ہوئے۔ آخر میں مَیں اُن سے کہا
کرتا تھا کہ پھر میرا پیر ہی کاٹ دو مگر وہ انکار کرتے رہے کہ ابھی یہ کارآمد

ہے۔ اب میں آپ کے پاس بھی اسی غرض سے آیا ہوں کہ یا تو یہ بارہ برس کا زخمی پیر اچھا کر دو یا اسے کاٹ ہی ڈالو'۔ مَیں نے معائنہ کر کے اور سارے اندازے لگا کر اُسے یہی کہا کہ ''اگرچہ تمہارا پیر خود بخود اچھا نہ ہو گا اور نہ آپریشن سے کچھ امید ہے کیونکہ اس کے اندر کی ہڈیاں بھی خراب ہیں مگر ابھی ایسا خراب نہیں ہُوا کہ اسے کاٹ کر الگ کر دیا جائے''۔ کہنے لگا کہ ''بارہ سال تو مجھے مصیبت اُٹھاتے ہو گئے اور مَیں ساٹھ برس کا ہو گیا، اب کب تک انتظار کروں''؟ مَیں نے کہا ''جب پیر زیادہ ناکارہ ہو جائے گا پھر آ جانا۔ ابھی تو یہ تمہارا بوجھ اُٹھا لیتا ہے کٹ جائے گا تو صورت حال اس سے بھی بدتر ہو جائے گی''۔ مگر بڈھے کی تسلی نہ ہوئی۔ چلا گیا۔

اگلے برس پھر آیا۔ مَیں نے پھر بھی وہی پہلا سا جواب دیا کہنے لگا ''کوئی صورت بھی اس کے کٹنے کی ہے''؟ مَیں نے کہا: ''ہاں اگر زخم ایسا خراب ہو جائے کہ پیر تمہارے کام کا بالکل نہ رہے تو مَیں یقیناً اسے کاٹ دوں گا''۔

پھر چلا گیا مگر چند روز کے بعد ہی اس کے رشتہ دار اسے چارپائی پر ڈال کر شفاخانہ میں لے آئے بڈھا سر اُٹھا کر فخریہ کہنے لگا کہ:

''آپ کاٹیں گے ہی''۔ مَیں نے کہا: ''کیوں''۔ بولا مَیں نے بندوق بھر کر اپنا پیر اُڑا دیا ہے۔ اب تو خدا کے واسطے اس لعنت کو الگ کر دو''۔ مَیں نے کھول کر دیکھا تو واقعی بندوق کے چھروں سے پیر کے ٹکڑے اُڑ گئے تھے۔ اپنے ہاتھ سے اُس نے گراب بھر کر ماری تھی اور اس وقت وہ واقعی آپریشن کا مستحق تھا۔ چنانچہ مَیں نے پیر کاٹ دیا۔ بڈھے میں صحت اور طاقت بہت تھی۔ پندرہ دِن میں بالکل اچھا ہو گیا۔ اور اس قدر خوش تھا کہ حدِ بیان سے باہر ہے ہر شخص کو اپنی کٹی ہوئی ٹانگ دکھاتا تھا اور خوش ہوتا تھا۔ بچارے کی



بارہ تیرہ سال کی تمنا اور مراد بر آئی تھی۔ آخر گھوڑے پر سوار ہو کر وطن کو چلا گیا۔ راستہ میں اور گھر پر جا کر وہ میرا ہی پراپیگنڈا کیا کرتا تھا۔ اور کہتا تھا کہ بارہ سال کے بعد فلاں ڈاکٹر نے مجھے نئی زندگی بخشی ہے۔ پھر ڈنڈا پکڑ کر اور پھدک پھدک کر لوگوں کو اپنی چال دکھاتا تھا۔ آخر یہاں تک نوبت پہنچی کہ تیسرے چوتھے ہفتہ اُس کے علاقہ کا کوئی نہ کوئی آدمی علاج کے لئے میرے پاس آ جاتا تھا۔

ان میں بعض ایسے بھی تھے جن کے پیر یا پیر کی انگلیوں پر معمولی زخم مزمن قسم کے ہوتے تھے۔ مگر وہ آتے ہی یہ کہتے تھے کہ ''ہمیں فلاں لنگڑے بلوچ نے بھیجا ہے اور آپ کو پیغام دیا ہے کہ ہمارا پیر کاٹ دیا جائے'' یعنی اُس نے اپنے جوش میں دوسروں کو بھی دیوانہ کر دیا تھا۔ اور ایسے لوگ جب میں اُن کا پیر کاٹنے سے انکار کرتا تھا تو سخت مایوس ہو کر واپس جایا کرتے تھے۔

## (55) خانساماں کی دُرگت

ایک دفعہ میں ایک نئی جگہ تبدیل ہو کر گیا۔ جہاں کچھ دِن کے بعد اطلاع ملی کہ ضلع کے صدر مقام سے صاحب سول سرجن تمہارے شفاخانہ کا معائنہ کرنے آ رہے ہیں۔ اُن کا قاعدہ یہ تھا کہ رات کی گاڑی سے اُتر کر ویٹنگ روم میں ٹھہر جایا کرتے تھے۔ پھر گیارہ بارہ بجے دِن کے شفاخانہ کا معائنہ کر کے ویٹنگ روم میں کھانا کھا کر تیسرے پہر کی گاڑی سے واپس اپنے صدر مقام کو تشریف لے جایا کرتے تھے۔

جس روز اُنہیں معائنہ کرنا تھا اُس روز صبح بڑے کمپاؤڈر نے مجھ سے کہا کہ ''صاحب بہادر رات کو تشریف لے آئے ہیں اب اُن کا خانساماں آتا

ہی ہوگا''۔ مَیں نے پوچھا ''کس لئے''؟ کہنے لگا ''چار پانچ سیر کوئلے، صابن
کی ٹکیا اور کچھ دیگر اشیائے متفرقہ تو شفا خانہ کی طرف سے لے جائے گا۔ پھر
کچھ اپنا ذاتی انعام سارے عملہ کی طرف سے اور کچھ اور چیزیں یعنی مرغی انڈا
وغیرہ آپ کی طرف سے بطور ڈالی کے''۔ مَیں نے کہا: ''یہ نیا دستور ہے یا
ہمیشہ سے یوں ہی ہوتا چلا آیا ہے''؟ کہنے لگا ''مَیں تو ہمیشہ سے یہی دیکھتا رہا
ہوں''۔ مَیں نے کہا ''پھر آج یہ جبریہ کاروائی نہیں ہوگی''۔ ہیڈ کمپاؤڈر کہنے
لگا۔

''آپ کیوں خواہ مخواہ دو چار روپوں کے لئے جھگڑا مول لیتے ہیں۔
بلا سے لے جانے دیں۔ خانساماں کہیں صاحب کو کہہ کر کوئی تکلیف نہ
پہنچائے''۔ مَیں نے کہا ''نہیں یہ باتیں دقیانوسی ہیں اب بند ہونی چاہیں''۔
اتنے میں خانساماں بھی بلائے بے درماں کے طرح آن پہنچا اور کہنے لگا ''ڈاکٹر
صاحب! صاحب بہادر کو ناشتہ کرنا ہے۔ پھرٹفن بھی وہیں ریل پر ہی کھائیں
گے۔ فلاں فلاں چیزوں کا بندوبست فرما دیجئے''۔ مَیں نے کہا ''صاحب تنخواہ
پاتے ہیں اور ہم سے زیادہ امیر ہیں تم ان کے لئے بازار سے یہ سب چیزیں جا
کر خرید لو یا پیسے دو تو مَیں منگوا دوں''۔ کہنے لگا ''ہمیشہ تو ڈاکٹر صاحبان یہیں
سے ہی بندوبست کر دیا کرتے تھے''۔ مَیں نے کہا: ''وہ ڈاکٹر صاحبان تو یہاں
سے تبدیل ہو کر چلے گئے۔ اب تو مَیں یہاں ہوں اور میرے نزدیک تمہارا
کوئی حق کسی چیز کے مانگنے کا درست نہیں ہے''۔ آخر وہ بھی گھاگ تھا تیز
ہونے لگا۔ مَیں نے دُھتکار کر اُسے نکال دیا۔ اور بائیسکل پر سیدھا ریل کے
ویٹنگ روم میں پہنچا پہلے تو سلام سلام ہوتا رہا پھر صاحب پوچھتے رہے کہ ''تم
کہاں ملازمت کے دوران میں پھرتے رہے ہو؟ کتنے برس کی ملازمت ہے؟
طن کہاں ہے؟ وغیرہ وغیرہ اتنے میں ہی وہی خانساماں دور سے پلیٹ فارم کی



طرف آتا ہُوا دکھائی دیا''۔ مَیں نے صاحب سے کہا کہ ''آج بھرے ہسپتال
میں لوگوں کے سامنے میری اور آپ کی بڑی بے عزتی ہوئی ہے''۔ کہنے لگے
''کیونکر''؟ مَیں نے کہا: ''آپ کا نوکر وہاں جا کر ہسپتال کے کوئلے، صابن اور
فلاں فلاں چیز آپ کے نام پر مانگتا تھا۔ مجھے بڑی غیرت آئی۔ کیونکہ آپ کی
اور میری دونوں کی اس بات میں سُبکی تھی۔ غرض مَیں نے اسے تو ٹال دیا۔ مگر
آپ اُسے سمجھا دیں کہ چار آنہ کے کوئلوں اور دو آنہ کے صابن کے لئے وہ
پبلک میں محکمہ کو ذلیل نہ کیا کرے''۔

یہ سُن کر ادھر تو صاحب کا منہ غصہ کے مارے سرخ ہو گیا اور اُدھر
خانساماں عین وقت پر میری شکایت صاحب سے کرنے کے لئے کمرہ کے
اندر گھسا۔ اُس کے اندر گھسنے کی دیر تھی کہ صاحب نے اُس پر گرجنا شروع
کیا۔ ''سکونڈرل''۔ ''ڈیم سوائن''، ''حرامزادہ'' ''سور کا بچہ'' اور گالیوں کے
ساتھ ہی ٹُھڈے پر ٹُھڈا برسنا شروع ہو گیا۔ پھر کہنے لگے کہ مَیں اِسے ہمیشہ
ان ذلیل حرکتوں سے منع کرتا رہتا ہوں مگر یہ باز نہیں آتا اگر اب ایسی کوئی
بات ہو گی تو اس بدمعاش کو موقوف کر دوں گا۔ آپ اس کو ایک پائی کی چیز
نہ دیں''۔

خانساماں منہ لٹکائے کمرہ سے باہر چلا گیا۔ میں وہاں تین سال رہا۔
مگر پھر اس شخص کی شکل میں نے نہیں دیکھی۔ اصل میں سارا قصور خانساماں کا
بھی نہ تھا بلکہ صاحب کی لاپرواہی اور لاعلمی بھی قابلِ گرفت تھی۔ مگر پھر میرے
سامنے کبھی اس قسم کا مطالبہ نہیں آیا۔ گربہ کشتن روزِ اوّل

## (56) مولوی کے کرتوت

ایک روز میں چکوال کے ایس ڈی او صاحب کے ہاں کسی مقدمہ کی

شہادت میں گیا۔ شہادت ختم ہو کر اِدھر اُدھر کی باتیں ہونے لگیں تو ایس ڈی او صاحب مجھ سے کہنے لگے کہ ''وہ کونے میں جو لمبی ڈاڑھی والا کالے رنگ کا بڈھا مولوی بیٹھا ہُوا ہے اُسے آپ نے دیکھا''؟ مَیں نے کہا: ''جی ہاں دیکھا''۔ کہنے لگے کہ ''یہ اس علاقہ کا بڑا بھاری مولوی ہے اور اس کا نام کرم دین ہے۔ آج یہ اس جرم میں میری کچہری میں حاضر کیا گیا ہے کہ اس نے جان بوجھ کر چند روپوں کے لالچ میں ایک عورت کا نکاح پر نکاح پڑھا دیا''۔ مَیں نے کہا: ''ہاں یہ مولویوں کی قوم ایسی ہی ہے''۔ اور اس شخص کو تو میں آپ سے بھی زیادہ جانتا ہوں۔ (علماء ھم شرٌّ مَنْ تحتَ ادِیْمِ السّماء)

## (57) مُردہ زندہ ہو گیا

مقدمہ بازی اس ملک میں اس حد تک جھوٹ اور فریب کی مرہونِ منت ہو چکی ہے کہ جب آپ سنیں کہ ''فلاں جگہ قتل ہو گیا ہے'' تو فوراً یقین نہ کر لیں۔ تھوڑی دیر کے بعد معلوم ہو گا کہ موت واقع نہیں ہوئی بلکہ صرف سر پھٹا ہے اور ضربِ شدید ہے تیسرے دِن معلوم ہو گا کہ نہیں ضرب خفیف تھی۔ اور آخر میں بالعموم سچّی بات یہ نکلے گی کہ صرف تُو تُو مَیں مَیں ہوئی تھی اور بس۔

ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ ایک تھانہ کا سب انسپکٹر کسی تفتیش پر مع کئی سپاہیوں کے باہر چلا گیا۔ اُس کے بعد حوالدار بھی کسی عدالت کی شہادت کے لئے سفر پر روانہ ہو گیا۔ پھر ہیڈ منشی بھی کسی فوری ضرورت کے لئے تھانہ خالی چھوڑ گیا۔ اب صرف ایک ناتجربہ کار کانسٹیبل جو کچھ تھوڑا سا پڑھا لکھا تھا تھانہ کا انچارج رہ گیا اُن کو ہم یہاں منشی جی کے نام سے پکاریں گے۔ منشی جی صبح ہی صبح آ کر تھانہ میں رجسٹر لے کر بیٹھے ہی تھے کہ کسی گاؤں کے چند جاٹ چارپائی



پر ایک آدمی کو لاد کر لے آئے جس پر لحاف پڑا ہُوا تھا۔ تھانہ کے صحن میں چارپائی کو رکھ کر وہ لوگ پکار پکار کر چیخنے لگے ''او دِیوان جی! او دیوان جی! خون ہو گیا قتل ہو گیا۔ ہمارے بھائی کو مار دیا''۔ ناتجربہ کار منشی جی نے کہا۔ ''اندر آ جاؤ اور یہاں بیٹھ کر رپٹ لکھواؤ''۔

وہ اندر چلے گئے اور یہ لکھوایا کہ ''رات کو ہم سو رہے تھے کہ اندھیرے میں چار پانچ آدمی جن کو ہم نے آوازوں سے پہچانا یک دم ہمارے بھائی رام سنگھ پر حملہ آور ہوئے اور اُسے مار مار کر قتل کر دیا۔ مارنے والے فلاں فلاں اشخاص فلاں گاؤں کے تھے''۔ پھر وہ کچھ رونے دھونے لگ گئے۔ منشی جی نے یہ سب رپورٹ لکھ لی اور ایک کاغذ پر مجھے یہ لکھا کہ ''مَیں ایک مقتول کو برائے ملاحظہ پوسٹ مارٹم بھیج رہا ہوں۔ مہربانی فرما کر نتیجہ سے اطلاع دیں''۔

یہ لکھ کر کاغذات ایک سپاہی کو دیے کہ اسسٹنٹ سرجن صاحب کو دے آ۔ وہ شخص کاغذ لے کر میرے پاس شفا خانہ میں جو تھانہ کے قریب ہی تھا پہنچا۔ مَیں حیران تھا کہ پوسٹ مارٹم کے لئے تو خاص فارم ہُوا کرتے ہیں، یہ سادہ کاغذ پر مختصر سی تحریر کیوں آئی ہے؟ سپاہی نے کہا کہ: ''سب افسر کارِ سرکار پر باہر ہیں ایک ناواقف منشی جی تھانہ کا کام بھگتا رہے ہیں۔ آپ نعش کا ملاحظہ کر لیں گے تو میں اصلی فارم بھروا کر لا دوں گا۔ دیوان صاحب بھی دوپہر تک آ جائیں گے۔ وہ باقاعدہ کاغذات بھر کے بھیج دیں گے''۔

اب وہاں کی سُنیئے سپاہی تو منشی جی نے میری طرف بھیج دیا تھا۔ اس کے بعد اُن لوگوں سے کہنے لگے کہ ''جاتے کیوں نہیں''؟ وہ کہنے لگے کہ ''جائیں کہاں''؟ منشی جی کہنے لگے۔ ''بیوقوفو! ابھی مَیں نے ڈاکٹر صاحب کو کاغذات برائے ملاحظہ نعش بھیجے ہیں تم چارپائی سرکاری لاش خانہ میں لے جاؤ۔ وہاں یہ نعش چیری جائے گی اور نتیجہ آنے پر مقدمہ کی صورت بن سکے

گی''۔

یہ سُن کر اُن جاٹوں کے رنگ فق ہوگئے۔ ''تو کیا اجی منشی جی! آپ نے لاش چیرنے کے لئے ڈاکٹر صاحب کو سچ مچ لکھ دیا''؟ منشی جی کہنے لگے۔ ''اور کیا کرتا؟ قاعدہ جو یہی ہوا''۔

اب تو وہ لوگ چکرائے اور کہنے لگے ''منشی جی! ذرا دیکھ تو لو شاید کوئی سانس اس مُردہ میں باقی ہو''۔

یہ سُن کر تو منشی صاحب کے تن بدن میں آگ لگ گئی اور بڑے غصہ سے کہنے لگے ''حرامزادو! پہلے کہا کہ ہمارا بھائی قتل ہوگیا ہے جب مَیں ابتدائی رپورٹ لکھ چکا اور ڈاکٹر صاحب کو اطلاع دے چکا تو اب بکتے ہو کہ دیکھ لو شاید کوئی سانس باقی نہ ہو''۔

یہ کہہ کر منشی جی تھانہ کے صحن میں آئے اور آتے ہی مُردہ کا لحاف گھسیٹ کر پرے پھینک دیا۔ رام سنگھ کے ننگے بدن کو جو ٹھنڈی ہُوا لگی تو وہ کانپنے لگا۔ اور منہ پر جو سیدھی دھوپ کی شعاع پڑی تو اُس کی آنکھیں جھپکنے اور مٹکنے لگیں۔ پھر کیا تھا منشی جی کے غصہ کا تھرما میٹر 212 پر جا پہنچا۔ ایک دو تین چار پانچ چھ ٹُھڈّے پر ٹُھڈّے جو رام سنگھ کو لگے تو وہ بندر کی طرح کود چارپائی سے دور جا کر کھڑا ہوگیا۔ منشی جی وہاں بھی اُس سے جا لپٹے ''کیوں بے تُو مرا ہُوا تھا؟ تُو مقتول تھا؟ تیرا خون ہو گیا تھا؟ جا اب اپنی لاش چیروانے حرامزادوں نے مجھے دھوکہ دیا اور ابتدائی رپورٹ ساری جھوٹ اور غلط لکھوائی ایک دِن کے لئے انچارج بنے تھے اب اُلٹی آنتیں گلے پڑیں سؤر کے بچے کتے کے پلّے''۔

اُدھر ہسپتال میں میں منتظر کھڑا تھا کہ نعش اب تک کیوں نہیں آئی۔ تھوڑی دیر میں ایک آدمی بھاگا ہُوا آیا وہاں تو اور ہی معاملہ ہوگیا ہے۔ اتنے



میں بڑے دیوان صاحب بھی دورے سے واپس آ گئے انہوں نے ساری غلطی اور ابتدائی رپورٹ بکمال حکمت ٹھیک ٹھاک کر دی۔ ورنہ ''منشی جی'' کی خیر نہ تھی۔

## (58) غیب دان پیر

شملہ میں ایک سال ایک غیب دان پیر صاحب تشریف لائے اور چند دنوں میں ہی انہوں نے غیر معمولی شہرت حاصل کر لی۔ اُن کا طریقہ یہ تھا کہ جو کوئی شخص اُن سے اپنے دِل کی بات پوچھنے یا کسی خواہش کا جواب لینے کو آتا تھا تو اُس کے ہاتھ میں ایک مُجلّد دیوانِ حافظ جس کی جلد پر کاغذ چڑھا ہُوا تھا دے دیا کرتے تھے۔ ساتھ ہی ایک پینسل اور سادہ کاغذ کا ٹکڑا۔ ابھی وہ شخص سامنے بیٹھ کر مگر اُن کی نظر سے اوجھل اپنا مطلب اس کاغذ کے ٹکڑے پر لکھ دیا کرتا تھا۔ اس کے بعد اُسے حکم ہوتا کہ ''تم اس کاغذ کو خود ہی لے جا کر اور پھاڑ کر باہر پھینک دو''۔ جب وہ پھینک آتا تھا تو غیب دان صاحب اندر کے کمرہ میں اسی دیوانِ حافظ سے فال لینے جاتے تھے۔ پھر باہر نکل کر کہتے کہ ''شاید آپ مقدمہ کے متعلق دریافت کرنا چاہتے ہیں۔'' ''یا'' آپ غالبًا اولاد کے خواہشمند ہیں۔ ''یا'' آپ کا دِل کسی کے عشق میں مبتلا ہے''۔ پھر آہستہ آہستہ پوری بات جو لکھی گئی تھی۔ تھوڑی تھوڑی تفصیل کے ساتھ بتاتے جاتے تھے۔ آخر کار جو کچھ اس سائل نے کاغذ پر لکھا ہوتا تھا وہ حرف بحرف اُسے سنا دیتے تھے۔ پبلک کے لوگ بہت حیران تھے کہ کس طرح یہ شخص بغیر دیکھے ہمیشہ صحیح جواب دیتا ہے۔ آخر کچھ دنوں کے بعد پیر جی کا بھانڈا پھوٹ گیا اور ساری چالاکی ظاہر ہوگئی۔

تفصیل اس عمل کی یوں ہے کہ پیر جی نے دیوانِ حافظ کی جلد اور اُس

کے اُوپر چڑھے ہوئے کاغذ کے درمیان ایک قطعہ کاربن پیپر کا اور اُس کے
نیچے ایک سفید کاغذ رکھا ہوتا تھا پنسل جو لکھنے کو دیتے تھے وہ نہایت سخت قسم کی
ہوتی تھی۔ اس لئے مجبوراً لکھنے والے کو خوب زور سے دبا کر اپنی عبارت لکھنی
پڑتی تھی۔ پھر اُوپر کا کاغذ تو سائل خود پھاڑ دیتا تھا مگر اندر کے کاغذ پر کاربن
پیپر کی وجہ سے وہ سب عبارت نقش ہوجایا کرتی تھی۔ اس کے بعد پیر جی اندر
جا کر اس کاغذ کو پڑھ لیتے تھے اور آہستہ آہستہ بڑی حکمت کے ساتھ سارا
مضمون بیان کر دیا کرتے تھے۔ غالباً پانچ آنے وہ اس عمل کی نذر کے لیا
کرتے تھے۔ اور دِن بھر میں اس طرح سے کئی کئی روپے کما لیتے تھے۔ سرکاری
دفاتر کے بابوؤں کا تو ہر وقت وہاں جمگھٹا لگا رہتا تھا۔

## (59) تندرستی اسے کہتے ہیں

لائل پور میں مردانہ اور زنانہ شفاخانے الگ الگ ہیں ایک دفعہ لیڈی
ڈاکٹر جو چار روز کی رخصت پر کہیں گئی تو اُس کی غیر حاضری میں ایک کیس
رات کے وقت ایک سکھ حاملہ عورت کا وہاں آ گیا۔ نرسوں نے اُس کے علاج
کے لئے مجھے بلالیا مَیں نے جا کر دیکھا کہ پچپن سال کی ایک تنومند مضبوط
عورت تھی جس کو تین دِن سے دردِ زہ ہو رہا تھا مگر بچہ پھنسا ہُوا تھا۔ باہر کی
بہت سی دائیوں نے کوشش کی تھی مگر ناکام رہی تھیں۔ مَیں نے کہا ''تمہارے
کتنے بچے اس سے پہلے پیدا ہوچکے ہیں''؟ کہنے لگی ''یہ تیرھواں بچہ ہے۔ اور
اس سے پہلے کسی ولادت میں کوئی تکلیف نہیں ہوئی''۔ مَیں نے جب اُس کا
ملاحظہ کیا تو وہ کیس عجیب سا معلوم ہُوا درد بھی ٹھیک اُٹھ رہے تھے بچہ بھی
درست پوزیشن میں تھا غیر معمولی بڑا بھی نہ تھا۔ مگر باوجود دردوں کے پیدا نہ
ہوتا تھا۔ خیر ڈاکٹری کی ایک حکمت سے وہ آدھ گھنٹہ میں پیدا ہوگیا۔ یعنی میں



نے بچہ کو پھیر کر اُس کے پیر نیچے کر دیئے۔ پھر اُسے کھینچ کر نکال لیا۔ اس کے
بعد چند منٹ میں آنول بھی نکل آئی۔ اور دس منٹ کے بعد ایک بڑا سا گولا جو
بچہ کے سر سے بھی بڑا تھا باہر نکلا جسے دیکھ کر ہم سب حیران ہوئے۔ وہ گولا نرم
اور تقریباً دو تین سیر کا تھا۔ آخر اُسے توڑ کر دھو کر اور کاٹ کر دیکھا تو معلوم ہُوا
کہ روئی ہے جو تیل میں تر بتر ہے۔ پوچھنے پر اس مریضہ کی ساتھی عورت نے
بتایا کہ جب بچہ پیدا ہونے میں ذرا دیر ہوئی تو وہاں کی دائی نے روئی کے
پنبے تیل میں بھگو کر اندر رکھ دیے تا کہ بچہ کو باہر پھسل آنے میں سہولت ہو۔
مگر وہ اتنے زیادہ تھے کہ خود پیدائش میں روک بن گئے۔ پھر دوسری دائی بلائی
گئی۔ اُس نے بھی وہی عمل کیا۔ پھر تیسری بلائی گئی اُس نے بھی اور کچھ ٹھونس
دیے اور یہی باعث تھا کہ بچہ پیدا نہیں ہوسکتا تھا۔ اور جب بچہ پیدا ہُوا تو پھر وہ
سب ملبہ اندر سے نکل آیا دوسرے دِن صبح کو جب میں زنانہ شفاخانہ میں گیا تو
مریضہ نے کہا۔ ''میں اچھی ہوں'' اور تیسرے دِن تو پلنگ سے اُتر کر کھڑی
ہوگئی کہ ''مَیں آج گھر جاؤں گی''۔ مَیں نے بہتیرا سمجھایا مگر اُس نے یہی کہا
کہ ''مجھے قطعاً کوئی تکلیف نہیں ہے میرا گاؤں یہاں سے پندرہ میل ہی تو ہے۔
ہم وہاں ٹم ٹم پر آرام سے پہنچ جائیں گے۔ خواہ مخواہ کیوں پلنگ پر بیمار بنی لیٹی
رہوں''۔ کوئی کمزور صحت نازک بدن شہری عورت ہوتی تو ایسی کاروائی سے فوراً
سَیپٹک ہوجاتی۔ اور نہ بھی ہوتی تو چالیس دِن کے بعد بھی بمشکل شفاخانہ سے
رخصت ہونے کے قابل ہوتی۔

## (60) گھی سے زکام

جالندھر اور امرتسر والے مشہور آنکھوں کے سرجن سمتھ صاحب کو نزلہ
بہت جلدی ہو جایا کرتا تھا۔ شفاخانہ میں کئی دفعہ ناک پونچھتے، چھینکیں لیتے اور

چھوں چھوں کرتے آیا کرتے تھے کہ آج خانساماں کم بخت نے گھی
کھلا دیا۔ اتفاق سے باورچی خانہ میں چربی ختم ہوگئی تھی اس لئے گھی کے ساتھ
گوشت کو فرائی کرلیا۔ اب اس گھی کھانے کا نتیجہ بھگت رہا ہوں۔

یہ سُن کر ہندوستانیوں کو تو حیرت ہوگی کہ چربی سے تو اُن کو کوئی
تکلیف نہ ہوتی تھی مگر گھی کھاتے ہی زکام اور نزلہ شروع ہو جاتا تھا۔ بات یہ
ہے کہ جو عادت بچپن سے ڈالی جائے وہی راسخ ہو جاتی ہے۔ اور جن چیزوں
کے روزانہ کھانے کا انسان عادی ہوجائے وہی طبیعت کے ساتھ مل جاتی ہیں۔
پنجاب کا آدمی تیل کھالے تو اُسے تکلیف ہوتی ہے اور یورپ کا رہنے والا گھی
کھالے تو وہ تکلیف پاتا ہے۔ غرض یہ کہ عادت بڑی زبردست چیز ہے۔

## (61) رابڑی

باجرہ کھانے والے غریب علاقوں میں ایک چیز رابڑی بنتی ہے اور
غریب ہو یا امیر مزدور ہو یا جے پور کا راجہ سب لوگ اس کے گرویدہ ہیں وہ
اس طرح بنتی ہے کہ باجرے کا آٹا چھاچھ یعنی کھٹی لسّی میں گھول کر دھوپ میں
کئی گھنٹے رہنے دیتے ہیں جس سے وہ جھاگ اور خمیر دیتا ہے اور اس میں کچھ
شراب کا سا نشہ پیدا ہوجاتا ہے۔ دھوپ میں کام کرنے والے مارواڑی
مزدوروں کا یہی ماء اللحم ہے جسے پی کر وہ خوب مگن ہوجاتے ہیں اصل بات یہ
ہے کہ ہر ملک اور قوم میں کسی نہ کسی قسم کے نشہ کا رواج ہے۔ کہیں تاڑی
استعمال ہوتی ہے، کہیں سیندھی، کہیں شراب تو کہیں رابڑی۔ کہیں شراب گنے
اور گڑ سے بناتے ہیں، کہیں چاول یا باجرے سے سندھ میں بھنگ کا زور ہے تو
راجپوتانہ میں افیون کا۔ سرحد میں چرس پیتے ہیں تو دوآبہ میں پوست۔ ولایت
میں وھسکی چلتی ہے یا بیئر بس ایک متقی مسلمان ہے جو مذہباً سب نشوں سے



پرہیز کرتا ہے۔ ورنہ بعض دوسری قومیں تو فخریہ انہیں استعمال کرتی ہیں۔

## (62) چنا

ایک دِن سونی پت کے شفا خانہ میں ایک بڈھا لالہ اپنے دو سال کے
پوتے کو گود میں لایا اور اُسے بینچ پر لٹا دیا۔ پھر کہنے لگا کہ ''یہ بچہ شاید چنا کھا گیا
ہے۔ اس لئے بے ہوش ہے''۔ مَیں نے کبھی چنوں سے لوگوں کو بے ہوش
ہوتے نہیں سنا تھا اس لئے اس کا مطلب نہ سمجھ سکا۔ بار بار پوچھا مگر وہ یہی کہتا
رہا کہ ''یہ شاید چنا کھا گیا ہے''۔ مَیں نے اُس سے کہا کہ ''تم چنا نہیں
کھاتے''؟ بولا ''مَیں تو کھاتا ہوں مگر مجھے تو کھانے کی عادت ہے اس بچہ نے
پہلے کبھی چنا نہیں کھایا تھا اس لئے اسے چنا چڑھ گیا ہے''۔ مَیں نے کہا ''تم پر
نہیں چڑھتا''؟

بولا کہ ''مجھے تو دمہ ہے اس لئے کھاتا ہوں اور عادت ہوگئی ہے اس
بچہ کو تو عادت نہیں''۔ اُس وقت مجھے پتہ لگا کہ اس کی مراد چنا سے کوئی خاص
چیز ہے۔ مَیں نے کہا ''تم جو چنے کھاتے ہو وہ ذرا دکھاؤ تو سہی'' اس پر اُس
نے جیب سے ایک ٹین کی ڈبیا نکالی اور کھول کر مجھے چنے دکھائے وہ چنے یہی
سفید کابلی چنے تھے جو ہمارے ملک میں پیدا ہوتے ہیں۔ بھلا بے ہوشی سے
چنے کا کیا تعلق؟ اتنے میں ایک واقف کار شخص اُسی وقت شفاخانہ میں آ گیا
اور ساری بات سُن کر کہنے لگا کہ ''ڈاکٹر صاحب یہ بڈھا تو بے وقوف ہے مجھ
سے پوچھو۔ دمہ کے مریض سبز دھتورے کا پانی نکال کر اُس میں کابلی چنے
ڈال دیتے ہیں۔ چنے اس عرق کو چوس کر موٹے ہو جاتے ہیں پھر اُن کو سایہ
میں سکھا لیا جاتا ہے جس سے اُن کا سائز پھر چھوٹا ہو جاتا ہے۔ دوبارہ بھی
وہی عمل کیا جاتا ہے اور سہ بارہ بھی غرض تین دفعہ بھگو کر اور سایہ میں خشک کر

کے وہ چنے دمہ والے ڈبیوں میں رکھ لیتے ہیں اور اُن کے ایک دو دانے روزانہ حسب ضرورت علاج کے طور پر کھا لیا کرتے ہیں۔ یہ لوگ ان کو ''چنا'' کہتے ہیں''۔

اس شخص کی یہ بات سُن کر میں بے ہوش بچہ کی طرف متوجہ ہُوا اور اُس کے معدہ میں ربڑ کی نلکی ڈال کر اُسے اچھی طرح اور بار بار دھویا۔ دھوتے دھوتے کھٹ کھٹ کر کے چلمچی میں تین چار چنے دھتورے والے آ پڑے اب تشخیص مکمل ہوگئی کہ دادا کا کہنا ٹھیک تھا۔ یہ سب دھتورہ کا ہی اثر تھا۔ خیر چند گھنٹہ میں بے ہوشی بھی جاتی رہی اور بچہ اچھا ہوگیا مگر بعض بڈھے بھی احمق ہوتے ہیں۔ اس کا دادا چنا چنا ہی کہتا رہا۔ یہ نہ منہ سے پھوٹا کہ دھتورہ والے چنے ہیں۔ اگر دوسرا آدمی آ کر ہمیں نہ بتاتا تو دادا سے تو آدھ گھنٹہ سر کھپائی رہی مگر اُس نے اصلی زہر کا نام نہ لیا۔ صرف چنا چنا ہی رٹتا رہا۔ بعض آدمی بھی کیسے بیوقوف ہوتے ہیں۔

## (63) عجیب فیملی ہسٹیریا

میں چکوال میں تھا کہ ایک عجیب بات سننے اور دیکھنے کا اتفاق ہُوا ایک گاؤں میں دو سگی بہنیں تھیں اور ایک اُن کا بھائی تھا جب میں نے اُن کے بھائی کو دیکھا تو وہ کوئی تیس سال کا جوان تھا۔ بہنیں دونوں اُس سے چھوٹی تھیں۔ اور بیماری اُن کو یہ تھی کہ ہر روز بلا ناغہ دو بجے دِن کے خواہ وہ ایک مکان میں ہوں یا الگ الگ' ایک بہن تو رونا شروع کر دیتی تھی اور دوسری ہنسنا۔ اور بھائی صاحب کو ہچکی لگ جاتی تھی۔ مگر شام کے قریب تینوں اچھے ہوجاتے تھے۔ اور دِن رات کے باقی حِصّہ میں اپنے سب کام کاج باقاعدہ کیا کرتے تھے۔ مگر جہاں ظہر کے وقت گھڑی کی سوئی عین دو پر پہنچی



تو خواہ ایک بہن چکوال میں ہو دوسری جہلم میں اور تیسرا بھائی دولمیال میں فوراً بھائی کو تو ہچکی لگ جاتی اور بہنیں رونا اور ہنسنا شروع کر دیتیں۔ مدتوں سے اُن کا یہی عمل جاری تھا۔ لوگوں نے مجھ سے پوچھا کہ یہ کیا بات ہے اور یہ کیسی بیماری ہے؟ اس علاقہ کے لوگ ''جادو ٹونہ جن بھوت'' کے بہت قائل ہیں اور ایسی بیماریوں کو اُن کی طرف ہی منسوب کر دیا کرتے ہیں۔ مگر میں نے اُن سے کہہ دیا کہ یہ ہسٹیریا کا مرض ہے اور کچھ نہیں ہاں یہ سبب ایک کنبہ کے تینوں آدمیوں کے بیمار ہونے کے ہم اسے خاندانی یا فیملی ہسٹیریا کہہ سکتے ہیں۔

## (64) ہر ملکے وہر رسمے

لاہور کی ملازت کے ایام میں میوہاسپٹل کے ہر ہاؤس سرجن کی چوتھے دِن رات بھر کی ڈیوٹی ہُوا کرتی تھی۔ بلکہ وہ سوتا بھی البرٹ وکٹر ہاسپٹل یعنی یورپین حِصّہ کے ایک کمرہ میں تھا۔ تاکہ وقت بے وقت نرس اُسے جگا سکے۔ ایک دِن میری ڈیوٹی تھی کہ ایک میم کو وہاں دردِزہ شروع ہوگئے۔ نرس مجھے بلا کر لے گئی اُس لڑکی کا پہلا بچہ تھا مگر اسے اپنی نسل سے اتنا عشق تھا کہ ہمارے ملک کی عورتیں تو دردوں کے وقت ہائے وائے کر کے چیختی ہیں مگر وہ یہ الفاظ کہہ رہی تھی۔

O Darling Come out, Sonny! Mother is waiting for you I am dying to have a look at your pretty face.

(یعنی اے میرے پیارے باہر نکلو بیٹا! ماں تمہارا انتظار کر رہی ہے میں تو تمہارا پیارا چہرہ دیکھنے کے لئے مر رہی ہوں۔'')

میں یہ سُن کر سخت متعجب ہُوا مگر ہر مُلکے و ہر رسمے۔

## (65) لاہور کا بچہ

پنجاب کے تمام ضلعوں میں لائلپور کا ضلع سب سے زیادہ امیر اور خوشحال ہے۔ اور خود لائلپور کا شہر بھی لاہور کا بچہ ہی ہے۔ جو چیز امرتسر، ملتان، راولپنڈی یا جالندھر میں نہ مل سکے وہ عام طور پر لائلپور میں مل جاتی ہے۔ دیہات تک کی مرفہ حالی کی یہ کیفیت ہے کہ ایک دفعہ مجھے ایک سکھ جو بالکل معمولی حیثیت کا تھا بُلا کر اپنی والدہ کی بیماری کے مشورہ کے لئے شہر سے چار میل کے فاصلہ پر اپنے گاؤں میں لے گیا گاؤں میں اس کی معمولی حیثیت کی ایک دیہاتی حویلی تھی۔ اندر زنانہ مکان تھا اور باہر مردانہ۔ مَیں نے مریضہ کو دیکھا۔ اور جب روانہ ہوتے وقت تانگہ پر بیٹھنے لگا تو وہ سکھ ہاتھ جوڑ کر کھڑا ہوگیا۔ کہ ''مہربانی کر کے لسّی تو پیتے جائیں۔ چھاویلہ (چھاچھ پینے کا چاشت کا وقت) ہے ہم غریب کسان ہیں ہماری عِزّت افزائی ہو جائے گی''۔

یہ کہہ کر اُس نے ڈیوڑھی میں جو میز پڑی تھی اُس پر سے چادر ہٹائی تو کیا دیکھتا ہوں کہ نہ تو وہاں لسی ہے نہ کٹورا نہ نمک بلکہ اُن کی جگہ شیشے کے مکلّف گلاس، نفیس پرچ پیالیاں، وھسکی کا اَدھا، سوڈے کی تین بوتلیں، برف کا ایک جنگی ڈلا، ولایتی بسکٹوں کا بنڈل، چائے مکھن اور پھلوں کی ایک ٹرے رکھی ہے۔ یہ تھی لائل پور کے ضلع کی لسی مگر میری طبیعت شراب کو دیکھ کر بہت منغّض ہوئی اور مَیں یہ کہہ کر چلا آیا کہ ''سردار جی میری داڑھی کا اور تمہاری اس میز کا کوئی جوڑ نہیں''۔

اسی طرح میں نے لائل پور کے اسٹیشن پر دیکھا کہ معمولی حیثیت کے



اہل مقدمہ جب صبح کی ٹرین سے وہاں اُترا کرتے تھے تو ریفرشمنٹ روم کے خانساماں سے یہ کہہ کر شہر کی طرف جایا کرتے تھے کہ ''ہم کچہری سے دو بجے آئیں گے تم ہمارے لئے کھانا تیار رکھنا۔ ہم پانچ آدمی ہیں۔ پانچ مرغوں کے کباب بنا رکھنا۔ کچھ مچھلی ہو کچھ کٹلٹ ہوں' باقی پراٹھے نیز ایک درجن سوڈے کی بوتلیں اور دو بوتل اوّل درجہ کی شراب اور دیکھنا کہیں برف نہ بھول جانا۔ یہ سب چیزیں وقت پر تیار رہیں۔ یہ تھا وہاں کی دولت کا کھیل جو میں نے 1924ء میں اپنی آنکھ سے دیکھا۔

## (66) بلوچی رسوم

بلوچی اقوام کی معاشرت بھی عجیب ہے۔ میں جب نیا نیا اُن کے علاقہ میں پہنچا تو دیکھا کہ مرد بھی عورتوں کے برابر لمبے لمبے بال رکھتے ہیں۔ دوسرے اُن کے ہاں یہ رواج ہے کہ جب بھی اور جہاں بھی کوئی آدمی کسی دوسرے سے ملتا ہے تو دونوں ایک دوسرے سے حال لیتے اور دیتے ہیں اور ہر متنفس کی حتیٰ کہ گھوڑی، گدھی، بیل، بکری، کتے، بلی تک کے نام بنام ایک دوسرے سے خیریت پوچھتے ہیں۔ نا محرم عورتیں غیر مردوں سے معانقہ کرتی ہیں۔ بلکہ دِن کے وقت ایک چار پائی پر اُن کے ساتھ لیٹ بھی جاتی ہیں اور مخفی مخفی بردہ فروشی کا سلسلہ بھی جاری ہے۔ عورتیں اسبغول بھگو کر اپنے سر کے بال چپکاتی ہیں۔ اور مہمان داری کے وقت میں نے ایک ایک روٹی اُن کے ہاں کی ایسی دیکھی ہے جسے آٹھ آدمی کھا سکتے ہیں۔ کسی رئیس کے ہاں شادی بیاہ ہو تو عجیب سماں ہوتا ہے۔ سینکڑوں گائیں، بکرے اور بھیڑیں پانچ منٹ میں ذبح ہو کر کٹ کر تیار ہو جاتی ہیں۔ نہ کوئی قصاب آتا ہے نہ قصائی۔ بڑے بچے اور عورتیں مل کر یہ کام کر لیتے ہیں۔ پھر کئی نالیاں فُٹ بھر گہری اور ایک

بالشت چوڑی کُھدی ہوئی تیار رکھتے ہیں۔ ان پر مٹی کی ہانڈیاں قطار در قطار چڑھا دیتے ہیں۔ چند لوگ مشکوں سے اُن میں پانی بھر دیتے ہیں۔ کچھ آدمی اُن میں گوشت ڈال دیتے ہیں۔ بعضے نمک مرچ ڈال جاتے ہیں۔ گھی کی جگہ چربی ہی کافی ہوتی ہے۔ پھر اُن نالیوں میں لکڑیوں کے ڈنڈے رکھ کر آگ لگا دی جاتی ہے۔ اور کچھ آدمی ہانڈیوں کا گوشت درختوں کی ٹہنیوں سے ہلاتے رہتے ہیں تاکہ جل نہ جائے بس دو گھنٹوں کے اندر پانچ سو ہانڈی تیار ہے۔ سالن لکڑی کے بڑے بڑے خوانوں میں اُنڈیلتے جاتے ہیں اور تندوری روٹیاں لے کر کھاتے جاتے ہیں۔ ان کے تندور بھی ایسے ہوتے ہیں کہ بیک وقت اُن میں تیس تیس روٹیاں لگ سکتی ہیں اور ہر روٹی آٹھ آدمیوں تک کے لئے کافی ہوتی ہے۔غرض ظہر سے پہلے پہلے ساری قوم کھا پی کر فارغ ہوجاتی ہے۔

ایسے بیاہ شادی کے موقع پر بیسیوں عورتیں اپنے بچوں کو دور دور فاصلوں سے علاج کے لئے وہاں لے آتی ہیں اور ذبح شدہ جانوروں کے گوبر جمع کر کے اپنے اپنے بچے اس میں ننگے دفن کر دیتی ہیں صرف منہ کھلا رہنے دیتی ہیں اور دودھ پلاتے وقت بچہ پر اوندھی ہوجاتی ہیں۔ آٹھ دس گھنٹے بچوں کو اس طرح رکھنا اُن کی آئندہ صحت کے لئے نہایت مفید سمجھا جاتا ہے۔ گویا ٹیکہ لگا دیا گیا ہے۔

## (67) ملامتی صوفی

لائل پور میں بازار کے ایک درخت کے نیچے ایک اُدھیڑ عمر کا فقیر یا ''سائیں'' مع اپنے کچھ مختصر سامان کے پڑا رہتا تھا اُس کی دونون ٹانگیں گھٹنوں کے نیچے سے کٹی ہوئی تھیں۔ اور جو ٹُھنڈ تھے اُن پر گول گول چمڑے کے خول بطور جوتیوں کے چڑھے رہتے تھے۔ اُن کٹی ہوئی ٹانگوں سے وہ فقیر خاصہ دوڑتا



پھرتا تھا۔ لوگ بھی اُس کی بڑی عِزّت کرتے تھے۔ کھانا پینا بہ افراط مل جاتا تھا اور مشہور تھا کہ کسی زمانہ میں یہ شخص ریلوے گارڈ تھا۔ ٹرین کے نیچے آکر اس کی دونوں ٹانگیں کٹ گئیں۔ اس کے بعد اُس نے فقیرانہ زندگی بسر کرنی شروع کر دی۔

ایک دِن کیا دیکھتا ہوں کہ وہ سائیں شفا خانہ میں چلا آرہا ہے میں نے پوچھا ''کیونکر اس طرف کا رُخ کیا''؟ کہنے لگا ''ایک ٹانگ میں بہت تکلیف ہے''۔ چمڑے کی ٹوپی ٹانگ کے سرے پر سے اُٹھا کر دکھائی تو وہاں ایک پھوڑا بن چکا تھا۔ میں نے سائیں کو کہا کہ ''شفا خانہ میں داخل ہو جاؤ۔ میں اس کا آپریشن کر دوں گا۔ کھانا سرکاری ملے گا۔ کوئی تکلیف نہ ہوگی اور تھوڑے دنوں میں اچھے ہو جاؤ گے''۔ وہ راضی ہوگیا اور میں نے اُسے وارڈ میں داخل کرا دیا۔ دوپہر کو اُس کا آپریشن ہوگیا اور وہ اپنی چارپائی پر جم کر مقیم ہوگیا۔ میں نے چپڑاسی سے کہہ دیا کہ سائیں جو بھی مانگے وہ اسے کھانے کو دیدیا کرو۔ اور اسے کسی قسم کی تکلیف نہ ہو''۔

شفاخانہ کے اس وارڈ یعنی بڑے کمرے میں چوبیس چارپائیاں تھیں اور سب کی سب بیماروں سے بھری رہتی تھیں۔ سائیں کا روزانہ ڈریسنگ ہوتا تھا۔ یہاں تک کہ اس کا زخم قریباً اچھا ہوگیا۔ ایک دِن جب میں صبح کو شفاخانہ کا گشت لگا رہا تھا تو کیا دیکھتا ہوں کہ سارے بیمار یا تیماردار اُس وارڈ کے اپنے اپنے پلنگ کے پاس ہاتھ جوڑے کھڑے ہیں۔ میں نے کہا ''آج کیا بات ہے''؟ وہ کہنے لگے ''حضور کچھ عرض نہیں کر سکتے''۔ میں نے کہا ''آخر کہو تو معاملہ کیا ہے''؟ کہنے لگے کہ ''ہمارے لئے اب اس وارڈ میں ٹھہرنا مشکل ہے۔ یا تو سائیں جی کو آپ کسی اور جگہ منتقل کر دیں یا ہمیں ہی دوسرے وارڈ میں بھیج دیں''۔ میں نے کہا: ''سائیں تمہارا کیا بگاڑتا ہے''؟ ایک شخص بولا کہ

''حضور کہنے کی بات نہیں ہے''۔ میں نے کہا ''آخر کہے بغیر کیونکر معلوم ہو گا کہ تمہاری بات سچ ہے''؟ اس پر وہ ایک دوسرے کو اشارے کرنے لگے۔ وہ اسے کہتا کہ تُو کہہ اور یہ اُسے کہتا کہ تُو کہہ۔ آخر ایک ہمت والا شخص تیار ہُوا اور کہنے لگا کہ ''یہ سائیں ایسی بات کرتا ہے جسے ہم دیکھ نہیں سکتے''۔ میں نے کہا ''یہی تو میں پوچھتا ہوں کہ کیا کرتا ہے''؟ آخر وہ شخص کہنے لگا کہ ''یہ نجاست کھاتا ہے''؟ میں یہ سُن کر سخت حیران ہُوا اور پوچھنے لگا کہ ''یہ نجاست کہاں سے لاتا ہے''؟ وہ کہنے لگا ''اجی کچھ نہ پوچھیے یہ چلنے سے تو معذور ہی ہے۔ یہیں چارپائی کے پاس برتن میں رفع حاجت کرتا ہے اور اُسی وقت اُسے لقمے بنا بنا کر اور چبا چبا کر کھا لیتا ہے''۔ مجھ پر تو یہ سُن کر گویا بجلی گر پڑی مگر سب نے اس کی تصدیق کی میں نے پوچھا۔ ''سائیں یہ لوگ کیا کہتے ہیں''؟ کہنے لگا۔ ''سچ کہتے ہیں''۔ پھر میں نے کہا ''تُو اپنا فُضلہ کھاتا ہے تُو تو جانوروں سے بھی گیا گزرا ہے'' کہنے لگا ''پیر کا ایسا ہی حکم ہے''۔ میں نے کہا ''ارے کم بخت کیا تجھے روٹی نہیں ملتی'' کہنے لگا ''جی ملتی کیوں نہیں۔ آپ کی مہربانی سے دودھ، چاول، روٹی، سبزی سب کچھ مل جاتا ہے۔ لیکن وہ بھی مرشد کا فرمان ہے۔

لوگ کہنے لگے۔ ''جناب عالی یہ اپنی روٹی بھی جو شفا خانہ سے ملتی ہے پوری کھا لیتا ہے اور مزید برآں یہ حرکت بھی کرتا ہے۔ کئی دِن سے ہم اسے منع کر رہے ہیں مگر باز نہیں آتا۔ اس لئے مجبوراً آپ سے رپورٹ کی''۔ میں نے بہتیرا سائیں سے کہا کہ ''یہ حرکت چھوڑ دے مگر اُس نے کہا برسوں کی عادت ہے۔ پیر مرشد کی وصیت ہے میں ملامتی ہو کر کس طرح اسے چھوڑ سکتا ہوں''؟ آخر میں نے اسے کہہ دیا کہ اب تمہارا زخم تقریباً اچھا ہے۔ تم جاؤ اور روزانہ آ کر ڈریسنگ کرا لیا کرو۔ یہاں رہنے کے قابل نہیں ہو''۔



اس طرح سائیں کو رخصت کر کے میں دیر تک سوچتا رہا کہ افسوس انسان جب گرنے لگتا ہے تو واقعی اسفل السافلین سے ورے دَم نہیں لیتا۔

## (68) ہچکی

میو ہاسپٹل لاہور کا ذکر ہے کہ 1907ء میں وہاں ایک مریض کا آپریشن ہوا۔ آپریشن کے کچھ دِن بعد بیمار کو ہچکی شروع ہوگئی۔ کئی دِن تو ہلکی ہلکی رہی۔ پھر تیز اور شدید ہوتی گئی۔ یہاں تک کہ رات کو اُس کی آواز ہمارے گھروں میں پہنچا کرتی تھی۔ وہ آواز بھی نہایت مہیب اور لمبی تھی۔ یوں معلوم ہوتا تھا کہ اسی ایک ہچکی میں اس شخص کا دم نِکل جائے گا۔ مگر ایک دِن نہیں۔ ایک ہفتہ نہیں تقریباً ایک مہینہ تک یہ ہچکی کا سلسلہ برابر جاری رہا۔ بلکہ آواز اُونچی ہی ہوتی چلی گئی۔ دوائیاں اور ٹیکے؟ وہ تو جو بھی تھے سب لگ چکے تھے پلستر بلسٹر، بجلی، مکسچر، مارفیا، ایروپین، نیند آور، اور تشنج دور کرنے والی دوائیں۔ غرض ڈاکٹروں کے تھیلے میں کوئی ایسی چیزیں باقی نہ رہی جو اس قابل رحم مریض کو دی نہ گئی ہو۔ مگر

مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی

ایک دِن اُس کونے میں جہاں مریض کا پلنگ رہتا تھا عمارت کی کوئی مرمت ہونے والی تھی اس لئے وہ پلنگ مع مریض کے کسی دوسری جگہ کر دیا گیا اور مرمت کے بعد پھر وہیں آ گیا۔ جب تک وہ شخص نئی جگہ رہا ہچکی بند رہی۔ جونہی اپنی پرانی جگہ پر آیا ہچکی پھر اس زور شور سے شروع ہوگئی۔ شام کو جب اُسے پٹی لگنے لگی تب اُس نے یہ بات بتائی، ہم نے کہا اچھا آج تمہارا ڈریسنگ باہر برآمدہ کے ڈریسنگ روم میں کریں گے۔ غرض اُسے اسٹریچر پر لاد کر اُس دوسرے کمرے میں لے گئے اور واقعی جیسا اُس نے بیان کیا تھا۔

جب تک پٹی لگتی رہی ہچکی بالکل نہ آئی۔ لیکن جونہی وہ اصلی جگہ اپنے پلنگ پر پہنچا ظالم پھر شروع ہوگئی۔ دوسرے دِن کرنل پیری کو جن کا وہ مریض تھا یہ رپورٹ کی گئی۔ اُن سے کہا گیا کہ اگر آپ اجازت دیں تو مریض کی جگہ اور پلنگ تبدیل کر دیے جائیں۔ صاحب نے کہا ضرور یہ بھی تجربہ کر کے دیکھ لو۔ اس بات پر عمل کرنا تھا کہ پھر اس کے بعد ایک ہچکی بھی اُسے نہیں آئی۔ نہیں تو یہ خیال پیدا ہوچلا تھا کہ یہ بیمار اب صرف چند دنوں کا ہی مہمان ہے۔ ماحول کی تبدیلی ہی غالبًا اصل وجہ تھی جس کا ہچکی پر اثر پڑا۔

## (69) سُراغرساں مجرم

گوجرانوالہ جیل میں وزیرآباد کا ایک اسکول ماسٹر جو بڑا ذہین اور تیز طرار معلوم ہوتا تھا پکڑا آیا وہ اپنے وطن میں محکمہ تعلیم کا ملازم تھا۔ ایک ہندو ادھیڑ عمر کی بیوہ نے اُسے اپنے لڑکے کو پرائیوٹ تعلیم دینے کے لئے ٹیوشن پر رکھ لیا تھا۔ رفتہ رفتہ ماسٹر نے لڑکے کو اپنے ساتھ اتنا ہلالیا کہ ہر جگہ اُسے ساتھ ساتھ لئے پھرتا تھا۔ چند روز کے بعد لڑکے کو سینما دکھانے لے گیا۔ پھر روز ہی لے جانے لگا۔ ایک دِن سینما کے انٹرول (وقفہ) میں لڑکے سے کہنے لگا کہ تو اُس پٹھان کے ساتھ چائے پی اور میں ابھی آتا ہوں۔ پٹھان اور لڑکا دوکان پر چائے وغیرہ پیتے رہے اور ماسٹر تھوڑی دیر غائب رہ کر واپس تماشا دیکھنے آ گیا۔ تماشا ختم ہونے پر ماسٹر اپنے گھر چلا گیا اور لڑکا اپنے گھر لڑکے نے جونہی گھر کے کمرہ میں قدم رکھا تو کیا دیکھتا ہے کہ ماں قتل ہوئی پڑی ہے اور اس کا سر ندارد ہے۔ رونے پیٹنے لگا۔ اہل محلّہ جمع ہو گئے۔ پولیس آ گئی اور نعش پوسٹ مارٹم کے لئے چلی گئی۔ ماں بیٹے اکیلے رہا کرتے تھے کسی کو پتہ نہ لگا کہ کون قاتل ہے۔ صرف وہ ماسٹر اُن کے گھر آیا جایا کرتا تھا۔ اب اُس نے بھی آنا



چھوڑ دیا۔ ماسٹر کی بھی تلاشی ہوئی مگر کچھ پتہ نہ لگا۔ آخر ایک سمجھدار تھانیدار نے اندازہ لگایا کہ یہ ماسٹر بڑا چالاک سا آدمی ہے۔ اور یہی ان لوگوں کے ہاں آیا جایا کرتا تھا اس سے کچھ پتہ چلے گا۔ چنانچہ تفتیش کے بہانے اُسے حوالات میں دے دیا۔ کیونکہ پولیس والوں کو ان معاملات میں غیر محدود اختیارات حاصل ہوتے ہیں۔ اس کے بعد ماسٹر کے گھر والوں کو کہلوا دیا کہ ماسٹر تو حوالات میں ہے تم اس کا کھانا صبح شام گھر سے بھیج دیا کرو۔

دو تین دِن کے بعد تھانہ دار نے ماسٹر کے کھانے کے اندر روٹیوں کے درمیان ایک رُقعہ لکھ کر رکھ دیا کہ ”ہوشیار رہنا اور کوئی بات قطعاً منہ سے نہ نکالنا“۔ ماسٹر نے اس رُقعہ کا کوئی جواب نہ دیا۔ دوسرے دِن اسی طرح کا اور کوئی فقرہ لکھ کر اندر رکھ دیا۔ غرض چار پانچ روز یونہی ہوتا رہا۔ مگر ماسٹر خاموش تھا۔ آخر چھٹے یا ساتویں دِن اُس نے یہ لکھ کر کہ ”میں تو ہوشیار ہوں کہیں تم نہ بول پڑنا“۔ خالی برتن میں رکھ دیا اور دستر خوان لپیٹ کر واپس بھیج دیا۔ اس سے یہ پتہ تو لگ گیا کہ ماسٹر جرم میں شریک تو ضرور ہے مگر یہ کون شخص ہے جسے اُس نے جواب دیا ہے؟ لڑکے کو بُلا کر پوچھا کہ ماسٹر کا دوست اور ملنے والا کون کون ہے؟ اُس نے کہا: ایک پٹھان ہے (جس کے ساتھ لڑکے نے سینما میں چائے پی تھی) اُس سے ماسٹر کا بہت یارانہ ہے۔ تھانہ دار نے اُس پٹھان کو گرفتار کر لیا۔ اور ماسٹر سے الگ کر کے دم دلاسا دے کر جو پوچھا تو وہ پھوٹ پڑا کہ یہ ماسٹر ہی کا کام ہے مگر تفصیل مجھے معلوم نہیں۔ اُس نے مجھ سے چھری مارنا اور ذبح کرنا سیکھا ہے۔ مگر اتنا پتہ ہے کہ اس عورت کے لڑکے کو چائے کی دکان پر میرے سپرد کر کے اُس نے اس عورت کے گھر پہنچ کر اُس کو ذبح کیا ہے۔۔ سر وغیرہ اس عورت کا کہیں دبا دیا ہے۔

جب تھانہ دار کی تشفی ہوگئی کہ ماسٹر ہی اصلی مجرم ہے تو اُس نے ماسٹر

جی کو شکنجہ میں کسنا شروع کیا۔ مجرم کا تعیّن ہو جائے پھر اقبالِ جرم کرانا بہت آسان ہوتا ہے۔ ماسٹر جی پولیس کے دستِ شفقت کی تاب نہ لاسکے۔ ساتھ ہی اُن کا دستخطی رُقعہ بھی موجود تھا اور پٹھان کی چغلی بھی۔ آخر انہوں نے اقبال کر لیا اور وزیر آباد کے نالے کے کنارے سے عورت کا گڑا ہُوا سر بھی نکال دیا۔ کیس مکمل ہوگیا اور ماسٹر جی اپنے کیفرِ کردار کو پہنچے۔

مگر اصل بات اب آتی ہے۔ میں نے اقبالِ جرم کے بعد ایک دِن جیل میں ماسٹر جی سے پوچھا کہ ''اس قتل کی وجہ کیا تھی''؟ تو کہنے لگے کہ ''بدقسمتی سے میں سراغرسانی، جرائم اور جاسوسی کے ناول پڑھا کرتا تھا اور جو کتاب بھی پڑھتا تھا اُس میں مجرم کی شکست اور انصاف کی فتح کا بیان ہوتا تھا۔ مجھے یہ بات ناگوار گزرا کرتی تھی۔ آخر مَیں نے ارادہ کیا کہ میں بھی ایک قتل کروں مگر اس ہوشیاری سے کہ مجرم کا پتہ نہ لگے۔ اس پر میں نے بلاوجہ اس عورت کو قتل کرنے کی اسکیم بنائی کہ دیکھوں میں کامیاب ہوتا ہوں یا نہیں۔ اب نتیجہ آپ کے سامنے ہے''۔

ماسٹر تو یہ کہہ کر اپنے بستر پر چلا گیا مگر اُس دِن سے میرے دِل میں یہ خیال جم گیا ہے کہ سراغرسانی کی کتابیں اور سینما کی جرائم آموز کہانیاں واقعی نوجوانوں کو برباد کرتیں اور اُن کی مجرمانہ فطرت کو اُبھارنے میں بہت مدد دے سکتی ہیں۔

## (70) کبھی یوں بھی ہوتا ہے

ایک دفعہ میرے پاس ایک جوان آدمی کی نعش پوسٹ مارٹم کے لئے لائی گئی۔ میں نے بعد ملاحظہ یہ لکھ دیا کہ اس کے سر پر کسی لاٹھی وغیرہ کی سخت ضرب لگی ہے جس سے کھوپڑی کی ہڈی چور چور ہوگئی ہے۔ اور یہی باعث



موت کا ہے۔ جو لوگ قاتل تھے انہوں نے یہ کہانی بنائی کہ ''یہ شخص ہم سے جھگڑا اور گالم گلوچ کر رہا تھا کہ غصہ اور طیش میں آ کر اُس نے دوڑ کر سامنے دیوار میں خود ہی اپنے سر سے ٹکر لگائی ہے جس کی وجہ سے کھوپڑی ٹوٹ گئی اور یہ مرگیا''۔

مقدمہ چلا میری گواہی ہوئی تو میں نے جرح کے جواب میں یہی کہا کہ ''اپنی مرضی سے دیوار کے ساتھ ایسی ٹکر مارنا کہ کھوپڑی کی ہڈی پاش پاش ہو جائے میرے نزدیک ناممکن ہے''۔ میری گواہی کو مشکوک کرنے کے لئے ایک بڑا ڈاکٹر اس مقدمہ میں بطور اکسپرٹ (ماہر) بُلایا گیا۔ اُس نے پانچ سو نقرئی ٹکے لے کر آتے ہی کہہ دیا کہ ''ہاں اس قسم کی ضرب خود ٹکر مار کر بھی لگ سکتی ہے''۔ چلو معاملہ مشتبہ ہوگیا اور قاتل ڈھول بجاتے اور پیپے کھڑکاتے بُری ہو کر آ گئے۔

## (71) ہٹا کٹا بیمار

مدت ہوئی میں ایک شہر کے سول ہسپتال میں اسسٹنٹ سرجن تھا کہ ایک دِن سول سرجن کے دفتر میں میڈیکل بورڈ کا اجلاس ہُوا ایک ممبر اس بورڈ کا خود سول سرجن تھا دوسرا چھاؤنی کا ایک ملٹری سرجن آ گیا تھا۔ تیسرا میں تھا۔ جب ہم بیٹھ چکے تو سول سرجن نے کچھ کاغذات دستخط کے لئے فوجی سرجن کے آگے کھِسکا دیئے۔ اُس نے دستخط کر کے میرے آگے سرکا دیئے۔ میں نے انہیں پڑھا تو معلوم ہُوا کہ کوئی انگریز ہے جو کسی آپریشن کے بعد اس قدر بیمار اور کمزور ہوگیا ہے کہ اُس کے لئے ایک سال کی رخصت ولایت جانے کے لئے منظور ہونی اشد ضروری ہے۔ کاغذ پڑھ کر میں نے کہا کہ ''میں اس پر کیونکر دستخط کروں۔ میں نے تو اُس شخص کی شکل بھی نہیں دیکھی''۔

سول سرجن میری یہ گستاخی دیکھ کر تُرشرُو سا ہوگیا اور کہنے لگا کہ ''اگر تمہیں ہم پر اعتبار نہیں ہے اور خود ہی دیکھنا چاہتے ہو تو مریض باہر فِٹن میں بیٹھا ہُوا ہے وہاں جا کر اُسے دیکھ لو''۔ میں جو باہر آیا تو فِٹن میں ایک نہایت گرانڈیل، سُرخ سفید، موٹا تازہ انگریز بیٹھا ہُوا تھا۔ میں نے اس سے پوچھا کہ ''آپ کا مریض جو رخصت پر جانا چاہتا ہے کہاں ہے''؟ میری حیرانی کی کوئی حد نہ رہی جب اُس شخص نے نہایت متکبرانہ انداز سے جواب دیا کہ ''وہ میں ہی ہوں''۔ میں نے کہا۔ ''آپ کی صحت تو بہت اعلیٰ اور عمدہ ہے''۔ کہنے لگا کہ ''مجھے فسچولا (بواسیر) کا مرض ہو گیا تھا۔ اُس کا اپریشن میں نے کرا لیا ہے۔ اور صحت کے متعلق اُن ڈاکٹروں سے پوچھو جو اندر بیٹھے ہیں۔ اُن کے نزدیک میرے لئے ایک سال کا ریسٹ (آرام) ضروری ہے۔ یہ جھاڑ کھا کر میں اندر آگیا اور کہا ''دُنیا میں بہت کم آدمی ہیں جن کی بظاہر ایسی عمدہ صحت ہو جیسی اس مریض کی ہے تاہم میں دستخط ضرور کردوں گا۔''

اصل بات یہ ہے کہ انگریز اگر ذرا بھی بیمار ہوجائیں تو لمبی رخصت لے کر وطن کو بھاگتے ہیں تا کہ ہندوستان کی گرمی میں کام کے قابل رہ سکیں۔ ہندوستانیوں کی طرح نہیں کہ دفتر کی کُرسی سے مرکر ہی اُٹھیں۔

## (72) جُھوٹ کی نحوست

کیمل پور میں میرے ایک ہم وطن سول سرجنی کے عہدے پر ترقی پا کر تعینات ہوئے۔ ایک دِن کو ہاٹ سے ایک فوجی سب اسسٹنٹ سرجن متوطن کیمل پور اُن کے پاس آیا کہ ''میں مدت سے لمبی رُخصت مانگ رہا ہوں۔ مجھے اس کی سخت ضرورت ہے۔ مگر افسر نہیں دیتے۔ اب چار روز کی اتفاقی رخصت لے کر یہاں آیا ہوں۔ پرمیشر کے لئے آپ ہی مجھ پر رحم کریں



اور کسی طرح میری مشکل آسان کریں۔'' انہوں نے محض ازراہِ ہمدردی ایک سرٹیفکیٹ اُسے دیدیا کہ ''یہ ڈاکٹر یہاں آکر بیمار ہوگیا ہے۔ اسے دس یا پندرہ دِن کی رخصت دی جائے یہ بیماری کی وجہ سے سفر نہیں کرسکتا۔'' اس کے بعد ان کا اردہ تھا کہ جب رخصت ختم ہوجائے گی تو مزید توسیع رخصت کا سرٹیفکیٹ دیدونگا۔ مگر جھوٹ کی نحوست سر پر منڈلا رہی تھی۔ جب سٹرٹیفکیٹ کوہاٹ پہنچا تو آفیسر کمانڈنگ نے تین ڈاکٹر ایم۔ ایس فوراً وہاں سے کیمل پور بھیج دیئے۔ وہ دوسرے دِن اس بیمار ڈاکٹر کے گھر پر پوچھتے پوچھتے پہنچ گئے۔ ڈاکٹر سیر سپاٹے کے لئے بازار گیا ہُوا تھا۔ جب آیا تو ان کو دیکھتے ہی اس کا رنگ فق ہوگیا۔ غرض معائنہ ہوا اور تینوں نے یہ رائے دی کہ ''ڈاکٹر چنگا بھلا ہے۔ اس نے سول سرجن سے ساز باز کرکے جھوٹا سرٹیفکیٹ حاصل کیا ہے۔'' چنانچہ سب اسسٹنٹ سرجن کو تو کورٹ مارشل نے ڈسمس کیا اور سول سرجن صاحب کا تنزل ہو کر پھر وہ اسسٹنٹ سرجن ہوگئے اور پچیس سال کی نوکری داغدار ہوگئی۔ آخر شرم کے مارے انہوں نے خود ہی پنشن لے لی اور یادِ خدا میں زندگی بسر کرنے لگے۔

## (73) ڈاؤن ایکسپریس

شملہ میں 1925ء کا ذکر ہے جبکہ میں رپن ہاسپٹل میں متعین تھا کہ ایک دِن قریباً دو بجے دِن کے ایک شخص ایک مزدور کی گود میں ایک 3 سال کا بچہ اُٹھوا کر ہسپتال میں داخل ہوا۔ وہ کچھ گھبرایا ہُوا سا تھا۔ بچہ کو لاکر مزدور نے ایک بینچ پر ڈال دیا اور اُس شخص نے یہ کہنا شروع کیا۔ ''ڈاکٹر صاحب! اس بچہ کو دیکھ لیں۔ میں نہیں جانتا یہ کس کا بچہ ہے۔ آپ پہلے یہ ملاحظہ کر لیں کہ اسے چوٹ تو نہیں لگی یا کوئی ہڈی وغیرہ تو نہیں ٹوٹی۔ اگر کوئی گزند نہ پہنچی ہو

تو پھر میں اسے تھانہ میں چھوڑ آؤں۔ پولیس والے آپ ہی اس کے وارثوں کو ڈھونڈ لیں گے''۔ میں نے دیکھ کر کہا کہ ''یہ بچہ تو میرا بھی دیکھا ہُوا ہے آپ کو کہاں سے ملا''؟ کہنے لگا کہ ''میں نیچے کھڈ میں جہاں کمیٹی کے جانور ذبح کئے جاتے ہیں اور جہاں اُن کا خون اور گوبر جمع رہتا ہے کھڑا تھا کہ لوئر بازار کی جانب سے یہ لڑکا کمیٹی کی نالی میں بڑے زور سے طوفان میل کی طرح نیچے کی طرف آتا نظر آیا۔ خدا جانے میل بھر اُوپر سے آرہا تھا یا ڈیڑھ میل سے۔ کاٹ روڈ کے پُل کے نیچے سے یہ گزرا۔ لدّاخی محلّہ کی نالی میں سے یہ گزرا۔ غرض کئی پل اور پلیاں گزرتا 40 میل فی گھنٹہ کی رفتار سے یہ نیچے کی طرف آیا۔ اگر سخت زمین پر اس رفتار سے پہنچتا تو پاش پاش ہی ہو جاتا۔ مگر نالی کے آخر پر خون اور گوبر وغیرہ کا ایک بڑا ڈھیر تھا یہ غڑاپ سے اُس کے اندر دھنس گیا۔ اگر میں دیکھنے والا موجود نہ ہوتا تو یہ اس میں ہی زندہ درگور ہو جاتا۔ لیکن میں غل مچاتا ہُوا دوڑا اور لوگوں کی مدد سے اسے نکالا۔ پہاڑی کے پہلو کی نالیاں بہت ترچھی ہوتی ہیں۔ پھر اُن میں چینی اور سیمنٹ کا فرش ہوتا ہے۔ جو پانی بہتے بہتے اتنا چکنا ہو جاتا ہے کہ کوئی چیز اس میں ٹھہر نہیں سکتی۔ خوش قسمتی کی بات یہ تھی کہ لڑکے نے موٹا روئی دار کوٹ اور اُونی ٹوپ پہن رکھا تھا جس کی وجہ سے کہیں رگڑ یا خراش نہیں لگی''۔ یہ سُن کر میں نے لڑکے کی ہڈیاں اور بدن ٹٹولا تو معلوم ہُوا کہ کوئی چوٹ نہیں لگی۔ لڑکا خاموش تھا بلکہ مسکرا رہا تھا۔ گویا وہ بھی مجھے پہچانتا تھا۔ رفتہ رفتہ ہمارے گرد بیماروں اور آنے جانے والے لوگوں کا ایک ہجوم ہو گیا اور چہ میگوئیاں ہونے لگیں۔ لوگ ایک دوسرے سے پوچھنے لگے کہ ''بھئی! کوئی جانتا ہے کہ یہ کس کا بچہ ہے''؟ آخر یہ صلاح ٹھہری کہ بچے کو نزدیک کے پولیس اسٹیشن میں بھیج دیا جائے۔ اور ٹیلیفون کے ذریعہ دیگر سب تھانوں میں بھی اطلاع کر دی جائے کہ ایک لڑکا جو قریباً 3 سال کی عمر کا



ہے۔ گورا پتلا دُبلا ہے اور روئی کا کوٹ اور اُونی کنٹوپ پہنے ہے غالباً لوئر بازار کے آس پاس سے نالی میں گرا ہے اور پھسلتا پھسلتا نالیوں نالیوں ہوتا ہُوا میل ڈیڑھ میل نیچے کھڈ میں مذبح کے پاس جا نکلا ہے۔ اگر کسی کا گم ہو گیا ہو تو وہ اُسے بڑے تھانہ میں سے لے جائے۔ ابھی یہ باتیں ہو رہی تھیں کہ شفاخانہ کے ایک کمپاؤڈر مولوی یحییٰ خان ڈسپنسری میں سے کام کر کے باہر نکلے۔ اور لوگوں کا ہجوم دیکھ کر سیدھے اِدھر کو ہی آئے اور کہنے لگے۔ ''یہاں کیا ہے''؟ لوگوں نے کہا ''جی کسی کا لڑکا ہے جس کے والدین کی تلاش ہو رہی ہے۔ نیچے بُوچڑخانہ کے پاس سے ملا ہے''۔ یحییٰ خاں کو بھی لڑکے کی شکل دیکھنے کا شوق ہوا۔ بھیڑ کو چیر کر آگے بڑھے تو دو آوازیں میں نے سنیں۔ ایک تو یحییٰ خاں کی ''ارے یہ تو میرا بیٹا ہے۔!'' اور دوسری لڑکے کی ''ابا! مجھے لے لو''۔ مجھے بے اختیار ہنسی آ گئی۔ سوچ رہا تھا کہ جبھی یہ لڑکا صورت آشنا معلوم ہوتا تھا اتنے میں یحییٰ خاں کہنے لگے کہ ''ابھی تھوڑی دیر ہوئی کہ میں گھر سے نکلا۔ لڑکا میرے پیچھے پیچھے تھا اور نالی پر کھڑا تھا۔ میں تو شفاخانہ کے اندر کام کے لئے چلا گیا اور یہ غالباً نالی پھلانگنے کی کوشش میں اس کے اندر ہی جا پڑا۔ بس پھر کیا تھا ڈوَن ایکسپرس بن گیا۔ اور کچھ عجب نہیں کہ تین منٹ میں میل بھر نیچے جا پہنچا ہو۔ اس روئی کے کوٹ نے اسے بچایا۔ نہیں تو سارا زخمی ہو جاتا۔ اور گندگی کے ڈھیر نے اس کی جان رکھ لی۔ ورنہ کسی سخت جگہ جا کر گرتا تو ٹکڑے اُڑ جاتے خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے جس نے میرے بچے کو سلامت رکھا''۔ پھر اسی طرح گندے اور آلودہ کپڑوں سمیت اُسے اٹھا کر اپنے گھر کو جو سامنے ہی تھا چل دیئے۔

## (74) زبان کے اختلاف کا فساد

پنجاب کے مختلف حصوں کی بولیوں میں اتنا فرق ہے کہ بعض دفعہ

زبان کی یہ ناواقفی بڑے فساد یا نقصان کا موجب ہوجاتی ہے۔ کسی علاقے میں بادنجاں کو بیگن کہتے ہیں اور کسی میں بتاؤں، کہیں شُہدا بدمعاش کو کہتے ہیں کہیں شریف اور غریب کو۔ کہیں ''لے ونج'' کے معنے ہیں لے جا۔ اور کہیں اس کے معنے ہیں ''لے بانس'' میں ایک دفعہ ملتان کے علاقے میں نیا نیا لگایا گیا تھا۔ وہاں چھوٹی لڑکی کو ''مائی'' کہتے ہیں۔ ایک شخص آ کر کہنے لگا کہ بخار کی دوائی چاہیئے۔'' میں نے پوچھا ''کس کے لئے؟'' کہنے لگا ''ایک مائی ہے اُسے روزانہ بخار ہو جاتا ہے۔'' میں نے عمر نہ پوچھی اور اندازہ کر لیا کہ کوئی عورت ہو گی پچاس ساٹھ سال کی۔ چنانچہ میں نے مائی کا نام لکھ کر دس گرین کونین کا مکسچر اُس کے لئے لکھدیا۔ دوسرے دِن وہ شخص پھر آیا اور اُس کی گود میں چھ سات مہینہ کی ایک لڑکی تھی۔ پرچی میرے سامنے رکھ کر کہنے لگا کہ ''کل اس مائی کے لئے بخار کی دوا لے گیا تھا مگر وہ اس کے پیٹ میں نہیں ٹکی۔ کوئی ایسی دوائی دیں جو پچ جائے۔'' میں نے کہا یہ تو کسی بڑی عورت کی پرچی ہے۔'' کہنے لگا ''نہیں۔ اسی مائی کے لئے آپ سے کل ہی یہ نسخہ لکھوا کر لے گیا تھا۔'' اُس وقت مجھے معلوم ہُوا کہ اس علاقے میں لڑکی کو خواہ وہ کسی عمر کی ہو مائی کہتے ہیں۔ میں نے کہا۔ ''تیری مائی کی قسمت اچھی تھی کہ اسے دوا قے ہوگئی۔ اگر اندر رہ جاتی تو شاید یہ آج قبر میں ہوتی۔'' کیونکہ چھ ماہ کی بچی کے لئے دس گرین کونین کی مقدار مہلک ہوسکتی ہے۔

## (75) دیہات کے ان پڑھ

میں مغربی پنجاب کے علاقے کے ایک شفاخانہ میں ابتدائی ملازمت کے زمانے میں متعین تھا۔ کہ ایک دِن ایک بڈھا شخص خاصا سفید پوش بظاہر سمجھدار میرے پاس آیا اور کہنے لگا کہ ''مجھے اپنی لڑکی کے لئے کچھ مرہم درکار



ہے۔'' میں نے لڑکی کا نام رجسٹر میں لکھ لیا۔ پھر پوچھا کہ ''لڑکی کی عمر کیا ہے۔؟'' بڑی دیر تک سوچ سوچ کر آخر اُس نے کہا کہ ''اگر اس کی شادی ہو جاتی تو دو بچوں کی ماں بن جاتی۔'' میں نے ہنس کر کہا۔ ''کوئی بیس برس کی ہو گی؟'' کہنے لگا۔ ''سائیں! ہم لوگ ان پڑھ ہیں حساب اور گنتی نہیں جانتے جو تیری مرضی ہو لکھ لے۔''

اسی طرح ایک بڈھا جو ستر سال سے کسی طرح کم نہ تھا۔ ایک دفعہ دوا لینے آیا۔ جب میں نے اُس سے عمر پوچھی تو بے ساختہ کہنے لگا یہی کوئی پندرہ سولہ سال کا ہوں گا۔''

## (76) پہلے کرتے ہیں پھر بھرتے ہیں

ایک بڑے عہدہ کے سرکاری افسر تھے جو میرے ملنے والے بھی تھے۔ جب ان کی زیادہ ترقی ہوگئی تو انہوں نے اپنی بیوی کو انگریزی پڑھانے کے لئے ایک گورنس رکھی۔ پھر بیوی کو حکم دیا کہ ''یہ کیا بیہودہ پردہ ہے جو تم میرے دوستوں سے کیا کرتی ہو۔ اسے چھوڑ دو۔'' غرض زبردستی اُس سے پردہ بھی چھڑا دیا۔ اس کے بعد انہوں نے اُس کو اپنے دوستوں سے بے جھجک کرنے کے لئے یہ وطیرہ اختیار کیا کہ کسی دوست کو شام کی چائے پر بلا لیتے اور آپ گھر سے نکل جاتے تا کہ بیوی بے تکلفانہ غیر مردوں سے بات چیت کر سکے۔ جب کئی سال اس قسم کی پریکٹس اور مشق کو ہو گئے تو ایک دفعہ اُن کے ہاں بچہ پیدا ہُوا جس کا رنگ اُن کے دوسرے بچے سے کچھ زیادہ سانولا تھا۔ آدمی تھے شکی فوراً ناحق کی بدظنی کر لی کہ میرا فلاں دوست جو بیرسٹر ہے اور قدرے سیاہ رنگ کا ہے یہ بچہ اس کا ہے (حالانکہ وہ خود بھی گورے نہ تھے) وہی بے تکلفانہ ہمارے ہاں آیا جایا کرتا تھا۔

غرض فساد شروع ہوا۔ یہاں تک کہ آیا کو حکم نہ تھا کہ اس بچہ کو باپ کے سامنے لاوے۔ یاروں دوستوں نے بہت سمجھایا اور ہر طرح سے یقین دلایا کہ تمہاری بیوی بالکل بے گناہ ہے۔ اگر تم میں ایسی ہی غیرت یا بدظنی کا مادہ تھا تو پھر تم بچاری کو مجبور کر کے لوگوں سے بے تکلف کیوں کراتے تھے؟ مگر وہ اپنی ہی اَڑ پر قائم رہے۔ آخر نوبت طلاق تک پہنچی اور ایک معزز گھرانا برباد ہو گیا۔ یورپ کی اندھی نقالی ہمارے ملک کے لئے نہایت تباہ کن ثابت ہوئی ہے۔ غیرت رکھنی مسلمانوں کی سی اور معاشرت رکھنی یورپ کی سی۔! ع

این خیال است و محال است و جنوں است

## (77) شفاخانہ اور تہوار

میرا ساری ملازمت کا تجربہ یہی رہا ہے کہ جب شب برأت آتی تھی تو رات کے دس بجے سے آتشبازی کے لئے جلے ہوئے مریض شفاخانہ میں آنے شروع ہوجاتے تھے اور دوسرے تیسرے دِن تک آتے رہتے تھے۔ عیدین کے بعد قولنج، اسہال، قے اور پیچش کے مریض اسی طرح آیا کرتے تھے عیدالفطر کے بعد زیادہ اور عیدالضحیٰ کے بعد کم۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ سارے رمضان کے روزے رکھنے کے بعد معدہ بہت نرم ہو جاتا ہے۔ پھر عید کے دِن جب سویّوں کی بُھرمار ہوتی ہے تو بے احتیاط لوگوں کو سخت تکلیف ہوتی ہے۔ بقرعید کے بعد کچا پکا گوشت اور کباب وغیرہ کھانے سے پیچش کی شکایت زیادہ دیکھی گئی ہے۔ اسی طرح سورج گرہن کے بعد کئی دِن تک لوگ اندھے یا نیم اندھے ہو کر علاج کے لئے آیا کرتے ہیں۔ کیونکہ بار بار سورج کی طرف دیکھنے سے نظر کو سخت نقصان پہنچتا ہے۔ اور کئی لوگ تو مستقل نابینا ہو جاتے ہیں۔ پہاڑوں پر جب برف میں دُھوپ کے وقت لوگ سفر کرتے ہیں تو برف



کی چکا چوند سے بھی یہی حال ہو جاتا ہے۔ یعنی بعض مسافر اندھے ہو جاتے ہیں۔

## (78) بھائی کی محبت

میں ایک دفعہ دہلی سے گوڑگاؤں کی طرف آر-ایم-آر کی چھوٹی لائن پر سفر کر رہا تھا تو یکدم ہماری گاڑی ایک دھکے کے ساتھ کھڑی ہوگئی۔ کچھ لوگ گھبرا کر اُتر کھڑے ہوئے کہ کیا حادثہ ہو گیا ہے؟ اتنے میں چند آدمی چیختے ہوئے گاڑی والوں کو مخاطب کرتے سنے گئے کہ ”کیا کوئی ڈاکٹر بھی اس گاڑی میں ہے“؟ میں جلدی سے اُترا۔ وہ مجھے ایک فرلانگ پیچھے لے گئے اور سنایا کہ ایک عورت مع اپنے دو بچوں کے زنانہ تیسرے درجہ میں بیٹھی تھی۔ ایک لڑکا دو تین برس کا تھا۔ اور دوسرا کوئی بارہ برس کا۔ چھوٹا لڑکا کھڑکی کے پاس بیٹھا تھا۔ پھر کھڑا ہو گیا۔ ماں کا منہ دوسری طرف تھا کہ وہ اچھلتا کودتا یک دم کھڑکی میں سے باہر جا پڑا۔ ماں نے چیخنا پیٹنا شروع کیا۔ اور بڑے لڑکے کو دو ہنٹر مار کر کہا کہ بھائی باہر گر پڑا ہے۔ بڑے لڑکے نے فوراً دروازہ کھول کر چھلانگ لگا دی۔ اتنے میں کسی اور مسافر نے خطرہ کی زنجیر کھینچ لی۔ گاڑی کھڑی ہوگئی مگر جہاں لڑکا گرا تھا۔ وہاں سے قریباً ایک یا ڈیڑھ فرلانگ۔ آگے جا کر میں جائے وقوع پر پہنچا تو پہلے بڑا لڑکا ملا۔ سر سے پیر تک زخمی نیم بے ہوش جسم پر جابجا خون آلودہ خراشیں، شاید ایک بازو کی نلی کی ہڈی بھی شکستہ تھی۔ آگے کچھ فاصلہ پر چھوٹا لڑکا تھا۔ جس کے بدن پر خراش تک نہ تھی۔ نہ کوئی چوٹ آئی تھی۔ نہ وہ رو رہا تھا۔ نہ سہا ہُوا تھا۔ یوں معلوم ہوتا تھا کہ گویا کوئی واردات ہی نہیں ہوئی۔ خیر لوگ دونوں لڑکوں کو اٹھا کر ماں کے پاس لائے تو بیچاری کی جان میں جان آئی۔ چھوٹے لڑکے کے بے داغ بچ جانے سے سبھی حیران تھے۔ مگر بڑے کو

بعض تو شاباش دے رہے تھے اور بعض کہہ رہے تھے۔ ''مفت کی چوٹ جُلاہا کھائے۔'' مگر میں خیال کر رہا تھا کہ اُس نے چھوٹی سی عمر میں برادرانہ ہمدردی کا نہایت قابل قدر نمونہ دکھایا۔

## (79) عورت دُنیا کی زندگی ہے

ڈاکٹر جب کسی مضروب کا معائنہ کرتا ہے تو اپنے رجسٹر میں اس مضروب کا نام' عمر' ذات' تاریخ' وقتِ ملاحظہ اور چوٹیں سب کچھ درج کرتا ہے۔ علاوہ ازیں ایک نشان شناخت کا بھی ضرور لکھا کرتا ہے تاکہ اگر مقدمہ چلے اور وکیل یہ جرح کرے کہ ''آپ نے اس مضروب کا جو حاضر عدالت ہے معائنہ کیا تھا یا وہ کوئی اور شخص تھا۔؟'' اُس وقت ڈاکٹر جواب دیتا ہے کہ ''وہ یہی شخص ہے کیونکہ میں نے اس کا جو نشانِ شناخت اپنے رجسٹر میں لکھا تھا وہ اس کے جسم پر موجود ہے۔ مثلاً یہ کہ مضروب کے دائیں رُخسار پر ایک تل ہے۔ یا دوّنی کے برابر ایک پرانے پھوڑے کا نشان ٹھوڑی پر موجود ہے یا مضروب کا نام انگریزی حرف میں اُس کے بازو پر کُھدا ہُوا ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔

ایک دفعہ میں جالندھر کی ایک عدالت میں ایک فوجداری مضروب کے متعلق شہادت دینے گیا۔ جب دے چکا تو وکیل صاحب نے مجھ سے پوچھا کہ ''ڈاکٹر صاحب! دومہینے ہوئے آپ نے ایک شخص کا معائنہ کیا تھا۔ جس پر یہ ضربات تھیں۔ مگر کیا آپ یہ بتا سکتے ہیں کہ یہ حاضر عدالت وہی شخص ہے جس کا آپ نے ملاحظہ کیا تھا۔؟'' میں نے اُس شخص کے بائیں بازو پر سے کپڑا اُٹھا کر ڈھانک دیا اور وکیل صاحب کو جواب دیا کہ ہاں یہ وہی شخص ہے۔ عدالت میں فریقین کے آدمی اور کئی تماشائی بھی تھے۔ اور کمرہ اہل مقدمہ اور ناظرین سے بھرا ہُوا تھا۔ وکیل صاحب نے پھر سوال کیا۔ ''کیا ثبوت؟''



میں نے کہا کہ' اس کے جسم پر وہی نشان شناخت موجود ہے جو دوماہ ہوئے میرے رجسٹر میں نوٹ کیا گیا تھا۔''

عدالت نے پوچھا ''وہ کیا نشان ہے؟'' میں نے کہا ''اس شخص کے بائیں بازو پر ایک ننگی عورت کی تصویر کھدی ہوئی ہے۔'' یہ کہہ کر میں نے اُس کے بازو پر سے کپڑا اونچا کردیا۔

کسی فسانہ کی کتاب میں ایک قصہ پڑھا تھا کہ ایک عدالت میں کوئی مقدمہ ہو رہا تھا۔ حاضرین جمائیاں لے رہے تھے اور کسی شخص کو بھی ملزم سے لے کر مجسٹریٹ تک کوئی دلچسپی مقدمہ میں نظر نہ آتی تھی کہ یکدم ایک عورت بطور گواہ کے عدالت میں پیش کی گئی۔ اس کا پیش ہونا تھا کہ عدالت دیکھتے دیکھتے گرم ہوگئی۔ ہر شخص مقدمہ میں دلچسپی لینے لگا اور تھوڑی دیر میں کمرہ ناظرین سے بھر گیا۔ گویا عدالت میں جان پڑ گئی۔ بعینہٖ یہی بلکہ اس سے بڑھ کر حال میرے سامنے اس مقدمہ کا ہوا۔ جب میں نے مضروب کے بازو کی برہنہ زنانہ تصویر لوگوں کے سامنے کھول دی شاید ایک زندہ اور ملبوس عورت سے عدالت میں وہ بجلی کی لہر نہ دوڑتی جتنی ایک کھدی ہوئی ننگی عورت کی تصویر سے۔ مجسٹریٹ اُس کو دیکھنے کے لئے الگ دوہرا ہُوا جاتا تھا۔ وکلاء الگ جھکے ہوئے تھے۔ اہل مد کٹھرے پر سے الگ لٹکا پڑتا تھا۔ منشی لوگ الگ الگ ہجوم کرکے آگئے تھے۔ اور پبلک کا تو یہ حال تھا کہ اس تصویر کی زیارت کے لئے ایک پر ایک گرا پڑتا تھا۔ گویا وہ عدالت کا کمرہ نہ تھا۔ بلکہ تماشے کا ہال تھا۔ برابر دس پندرہ منٹ تک یہی حال رہا۔ بیسیوں لوگوں کی نگاہ شوق اس تصویر پر اس طرح گڑی ہوئی تھی کہ اٹھنے کا نام ہی نہ لیتی تھی۔ اور اُدھر مضروب کا شرم کے مارے یہ حال تھا کہ اگر زمین اُس وقت پھٹ جاتی تو وہ سما جاتا۔

غرض عورت جس میدان میں بھی آجائے وہاں ایک جان اور زندگی

ڈال دیتی ہے۔ صرف جیتی جاگتی عورت ہی نہیں بلکہ اُس کی تصویر بھی۔

## (80) گُھٹائی

ہندوستانی طالب علم بس رٹنا جانتے ہیں۔ یہ ضروری نہیں کہ وہ مضمون کو سمجھیں یا نہ سمجھیں۔ مجھے ایک دفعہ پانی پت میں حالی مسلم ہائی اسکول کے ہیڈ ماسٹر شاہ عالم خان صاحب نے (جو بعد میں صوبہ سرحد کے ڈائریکٹر تعلیمات ہوگئے تھے اور اسی عہدہ سے ریٹائر ہوئے) کہا کہ ''آپ ہمارے مدرسہ کی آٹھویں جماعت کا امتحان لیں۔'' میں نے جماعت کے ایک بہترین اور لائق لڑکے سے سوال کیا کہ ''شہاب الدین غوری کون تھا۔؟'' اب آپ لڑکے کا جواب سنئیے۔ اُس نے نہایت درجہ روانی سے اپنے جواب کو یوں شروع کیا:۔

''اِس راجہ کو گدی پر بیٹھے ابھی بہت عرصہ نہ گزرا تھا کہ اس پر ایک بڑا بھاری غنیم شمال کی طرف سے چڑھ آیا۔ اس حملہ آور کا نام شہاب الدین غوری تھا۔'' میں نے اس زمانہ کی درسی کتاب تاریخ ہند نکال کر دیکھی تو معلوم ہُوا کہ اس میں شہاب الدین غوری سے پہلے راجہ پرتھی راج کا ذکر تھا۔ پھر نیا پیرا شہاب الدین غوری کے متعلق ان الفاظ میں شروع کیا گیا تھا جنہیں میں نے اُوپر نقل کیا ہے۔

اب اتنی ہی بات سے آپ اندازہ لگاسکتے ہیں کہ ہمارے اسکولوں میں تعلیم ہوتی ہے یا گُھٹائی!

## (81) نظر کا دھوکا......!

کسی شخص کی بیوی کو کوئی دوسرا شخص اغوا کر کے لے گیا اور اُس عورت



کو ملازم لڑکا بنا کر اپنے پاس رکھا۔ سر پر پگڑی باندھ دی۔ بال سکھوں کی طرح اُلٹے کر دیئے۔ زیور اُتار دیا اور مردانہ کپڑے پہنا دیئے۔ مگر پولیس نے چند ماہ کی کوشش کے بعد آخر اس کا کھوج لگالیا۔ چونکہ عمر کا سوال تھا اس لئے وہ عورت اُسی مردانہ لباس میں میرے پاس لائی گئی۔ میں نے معائنہ کر کے لکھ دیا کہ ''اس کی عمر پندرہ سال کے قریب ہے۔'' سولہ سال سے کم عمر کی نابالغ عورت کے اغوا کی وجہ سے اغوا کرنے والے پر مقدمہ شروع ہوا۔ جب میں عدالت میں شہادت دینے گیا تو اُس وقت وہ عورت رنگین زنانے کپڑے پہنے وہاں موجود تھی۔ عدالت نے پوچھا ''کیا یہ وہی عورت ہے؟'' میں نے کہا ''ہے تو وہی مگر اب ان کپڑوں اور عورت کی اصلی حیثیت میں یہ بڑی عمر کی معلوم ہوتی ہے۔' چنانچہ عدالت میں ہی اس کا دوبارہ ملاحظہ ہوا۔ میں نے رائے دی کہ ''اب میں اس کی عمر اٹھارہ بیس سال سے کم نہیں سمجھتا۔'' مجسٹریٹ اور وکیلوں نے بھی میری تصدیق کی۔ بات یہ تھی کہ مردانہ لباس میں وہ لڑکی صرف پندرہ سال کا لڑکا نظر آتی تھی اور زنانہ لباس میں 20 سال کی عورت۔ یہ بھی ایک نظر اور خیال کا دھوکا ہے۔ عورت کی صحیح عمر عورتوں ہی کے لباس میں ٹھیک اور صحیح معلوم ہوتی ہے۔ ورنہ انسان غلطی کھاسکتا ہے۔

## (82) ذرا سی لاپروائی کا نتیجہ

ایک شخص کی دائیں آنکھ میں گلاکوما یعنی کالا پانی اُتر کر نظر بالکل جاتی رہی تھی۔ مگر بائیں آنکھ اچھی بھلی تھی۔ وہ ایک شفاخانہ میں گیا اور کہا کہ ''میری دائیں آنکھ اندھی اور لاعلاج ہوچکی ہے مگر اس میں پھر بھی سخت درد رہتا ہے۔ جس سے میری زندگی تلخ ہے۔ جس ڈاکٹر سے پوچھتا ہوں وہ یہی کہتا ہے کہ ''اب اس اندھی اور موذی آنکھ کو نکلوا دو۔ اس لئے آپ اس کا آپریشن کر کے

مجھے اس ہروقت کے درد سے نجات دیں۔ پہلے جس ڈاکٹر کے پاس گیا تھا، اس نے دیکھ کر یہی کہا کہ نکلوا دینے کے سوا اس دُکھ کا کوئی علاج نہیں۔ نکلوا کر اس کی جگہ مصنوعی شیشے کی آنکھ ڈالوالینا۔''

واضح ہو کہ عموماً ایسی آنکھ میں بظاہر کوئی عیب نظر نہیں آتا بلکہ دیکھنے والوں کو وہ ایسی ہی تندرست دکھائی دیتی ہے جیسے دوسری بینا آنکھ۔

خیر مریض کو داخل شفاخانہ کرکے دوسرے دِن اُسے کلورافارم سے بے ہوش کردیا گیا۔ مگر غلطی یہ ہوئی کہ اس کے ٹکٹ پر اُس سے پوچھ کر یہ نوٹ نہیں کیا گیا کہ دائیں آنکھ اندھی ہے یا بائیں؟ دیکھنے میں بظاہر دونوں یکساں تھیں۔ بے ہوش کرنے کے بعد جب ڈاکٹر نے آپریشن کرنا چاہا تو اُس نے کمپاؤڈر سے پوچھا کہ ''کونسی آنکھ اندھی ہے؟'' اس نے جواب دیا کہ ''مجھے معلوم نہیں۔ غالبًا بائیں میں درد کہتا تھا۔ اور وہی اندھی ہوگی۔'' ڈاکٹر نے خود بھی دیکھا مگر دونوں آنکھوں میں کوئی فرق نہ پایا۔ کیونکہ کرونک گلاکوما میں اکثر ایسا ہوتا ہے کہ پتہ نہیں لگتا جب تک مریض خود نہ بتائے۔ بہرحال کمپاؤڈر کی رپورٹ اور غلط اندازہ کی بنا پر اُس کی بائیں آنکھ نکال دی گئی۔ یعنی وہ آنکھ جس میں سے نظر آتا تھا۔ آپریشن ہوچکا۔ پٹی بائیں آنکھ پر باندھ دی گئی اور بیمار کو اپنے بستر پر پہنچادیا گیا۔ مگر آپ اُس دکھ اور آہ وفغاں کا اندازہ نہیں کرسکتے جو اُس مریض نے برپا کیا۔ جب ہوش میں آکر اس کو یہ معلوم ہُوا کہ درد والی آنکھ تو سلامت ہے۔ اور اُس کا درد بھی اُسی طرح موجود ہے۔ مگر اُس کی زندگی اور روشنی کا سہارا یعنی بائیں آنکھ ہمیشہ کے لئے اس سے جدا ہوچکی ہے۔ ڈاکٹر کو بھی سخت رنج تھا مگر کمان سے تیر نکل چکا تھا۔ ایک ذرا سی غلطی کا خمیازہ یہ ہُوا کہ ایک شخص کی زندگی تا بمرگ تیرہ و تار ہوگئی۔ یہ ہے خدائی تقدیر! یا بندہ کی غفلت......!!۔



## (83) حکمتیں اور پراپیگنڈا

جب میں لاہور میں ڈاکٹری کی تعلیم حاصل کررہا تھا تو وہاں ایک مشہور حکیم بزرگ شاہ تھے جو دوا اور تعویذ دونوں سے بیک وقت اپنے مریضوں کا علاج کیا کرتے تھے۔ مثلاً بیمار کو قبض اور اس کے عوارض ہیں تو کوئی جوشاندہ بھی لکھ دیا کرتے تھے اور ساتھ ہی ایک تعویذ بھی دیا کرتے تھے کہ اسے پانی میں مل کر پی لینا۔ اور حکمت اس کی یہ تھی کہ دوات کی سیاہی میں انہوں نے روغن جمال گوٹہ ملا رکھا تھا۔ جب اس طرح کی سیاہی سے لکھے ہوئے تعویذ کو مریض پانی میں گھول کر پیتے تھے تو اُن کو قبض کشائی ہوجاتی تھی بلکہ کھل کر دست آجاتے تھے۔ لیکن عام لوگ اسے تعویذ کا اثر ہی سمجھتے تھے۔

اسی طرح ایک اور حکیم صاحب تھے انہوں نے اشتہار دیا کہ کونین سخت گرم چیز ہے۔ کلیجہ پھونک دیتی ہے اور غیر ملک کی پیداوار ہے۔ اس لئے ہم نے بہت لمبے تجربہ کے بعد ایک دوا دارین تیار کی ہے جس میں یہ خرابیاں اور نقائص بالکل نہیں ہیں۔ اور کونین سے زیادہ مفید ثابت ہوئی ہے۔ حالانکہ وہ دوا بھی کونین ہی تھی۔ صرف بدل کر ہم معنی نام رکھ دیا تھا۔ کونین کے معنی عربی میں ہیں دونوں جہان۔ دارین کے معنی بھی یہی ہیں۔ پس جھوٹ بھی نہ ہُوا اور لوگوں کو دھوکہ بھی دے لیا۔ یہ تو صرف دو مثالیں ہیں۔ مگر ایسے بہت سے شعبدے چھٹے بڑے معالجوں کے بائیں ہاتھ کا کرتب ہیں۔ چنانچہ ایسپرین جیسی سستی اور مفید دوا طرح طرح کے ناموں سے لاکھوں روپیہ کی آمدنی کا ذریعہ بنی ہوئی ہے۔ ماء اللحم دو آتشہ اور سہ آتشہ کے نام سے وہسکی اور برانڈی ملا کر مفرح شربت اور مقوی عرق بیچے جاتے ہیں۔ اور حلال طیب نبیذ کے نام سے کئی ناواقف مسلمان حرام اور اُم الخبائث شراب کو خریدتے اور استعمال کرتے

ہیں۔ یہ ہیں پراپیگنڈے کے کرشمے اور دواؤں کے اصل اجزاء لیبل پر ظاہر نہ کرنے کے نتائج۔

ایک دِن مجھے ایک شخص دوڑتا ہُوا اپنے گھر پر بُلانے آیا کہ میرا نوجوان لڑکا ڈوب گیا ہے۔ اس کو پانی سے نکال کر رکھا ہُوا ہے۔ آپ دیکھ لیں کہ جان باقی ہے یانہیں میں جب اُس کے گھر پر پہنچا تو ایک دہلی کا پاس کردہ حکیم آلۂ سینہ بین غریق کی ٹُھڈی پر لگا کر آوازسُن رہا تھا۔ پھر کہنے لگا ''اس کی جان عجب الذنب میں آ گئی ہے۔ اگر کوشش کی جائے تو کامیابی ہوسکتی ہے۔......!!!'' حالانکہ غریق ایک گھنٹہ ہُوا مر چکا تھا۔

## (84) احمقانہ رازداری

ایک شہر میں ایک سیٹھ صاحب رہا کرتے تھے۔ اُن کا ایک لڑکا سات آٹھ سال کی عمر کا تھا۔ سیٹھ امیر تو تھے ہی مگر وہمی بھی حد درجہ کے تھے اورلڑکا بھی اکلوتا اور بہت پیارا تھا۔ ایک دِن لڑکے کو بخار ہوگیا۔

جھٹ گلی کے نکڑ والے ڈاکٹر کو بلا کر دکھایا تو اُس نے کونین مع فیورمکسچر کے دیدیا۔ ہندوستان میں ملیریا کی اتنی کثرت ہے کہ ہر بخار کی تشخیص ابتدائی ایام میں عموماً ملیریا ہی ہوتی ہے۔ سیٹھ صاحب نے ایک گھنٹہ کے بعد بخار میں کمی نہ دیکھی تو جھٹ بڑے بازار والے ڈاکٹر کو بلایا اور نوکروں کوسمجھادیا کہ ہرگز کوئی شخص اُس ڈاکٹر کو یہ نہ بتائے کہ گلی والا ڈاکٹر پہلے یہاں ہوگیا ہے۔ چنانچہ وہ ڈاکٹر بھی آیا اور اُس کو بتایا گیا کہ ابھی تک کسی ڈاکٹر نے مریض کونہیں دیکھا نہ کسی کا علاج ہُوا ہے۔ اُس نے بھی قدیم رواج کے موافق اُسے کونین کی کچٹ اور کوئی مکسچر دیدیا ایک گھنٹہ کے بعد سیٹھ صاحب نے چوک والے ڈاکٹر کو بلوایا اور اس سے بھی پہلے ڈاکٹروں کے نام اور ان کے نسخے مخفی



رکھے گئے۔ اس بچارے نے بھی یوکنین اور ایسپرین ملا کر لڑکے کو دینی شروع کی جس سے کچھ پسینہ بھی آ گیا۔ مگر ڈاکٹروں اور علاج کا سلسلہ رات بھر برابر چلتارہا۔ جوبھی آیا اُس نے اپنے تئیں پہلا معالج سمجھ کر مریض کے حلق میں کونین ٹھونسی اور غضب یہ کہ سیٹھ صاحب ایک ایک دودو گھنٹہ بعد معالج بدلتے رہے اور نتیجہ کا انتظار کئے بغیر معالج سے یہ مطالبہ کرتے رہے کہ ''بخار ابھی اُتر جائے۔'' اور کسی کو یہ نہ بتایا کہ تم سے پہلے بھی کوئی ڈاکٹر آیا تھا۔ اور وہ یوکنین کی پڑیا یا ایسپرین اور کونین کی کچٹ کھِلا گیا تھا۔ یا کونین مکسچر پلایا گیا تھا۔ آخر کونین کھاتے کھاتے لڑکے کوسخت ہذیان شروع ہوگیا۔ پچھلی رات کو اُسے ایک ڈاکٹر نے کونین کا ٹیکہ زیر جلد لگایا اور صبح ہوتے ہوتے آخری معالج نے جسے پہلے علاج کا علم نہ تھا ورید کے اندر 5 گرین کونین ڈال دی۔ نتیجہ یہ ہُوا کہ اٹھارہ گھنٹہ کے اندر قریباً ایک ڈرام کونین مریض کے اندر پے درپے پہنچ گئی۔ جس نے اُسے بسرعت اللہ میاں کے ہاں پہنچا دیا۔ یہ ہے نتیجہ اخفا کی بے وقوفی اور احمقانہ رازداری کا۔

## (85) ذرا سا فرق

خدا تعالیٰ جس کو چاہتا ہے عِزّت دیتا ہے۔ اور جس کو چاہتا ہے ذلت۔ بات وہی ہوتی ہے مگر اُس کے نتیجہ میں ایک کا ذکرِ خیر ہونے لگتا ہے اور دوسرے پرلعنت کی پھٹکار پڑنے لگتی ہے۔

ایک شخص تھے اُن کی عمر ستّر سال کے قریب تھی۔ ایک دِن سجدے میں اُن کی حرکت قلب بندہوگئی۔ دیر تک نہ اُٹھے۔ لوگوں نے دیکھا تو مرے پڑے تھے۔ فوراً ان کی بزرگی کا چرچا اور ولایت کا ڈنکا بجنے لگا واہ واہ ہونے لگی۔ صرف اِس وجہ سے کہ اُن کا سجدہ کے اندر انتقال ہُوا تھا۔

چند دِن کے بعد ایک اور بڈھے میاں بھی حرکت قلب بند ہونے سے
اسی طرح یک دم مرگئے۔ مگر بدقسمتی سے جب وہ مرے تو بیت الخلا میں اُن کا
دم نکلا۔ جہاں وہ اوندھے منہ نجاست کی بالٹی میں گرے ہوئے پائے گئے ۔
بس اتنی سی بات تھی۔ پھر کیا تھا فوراً شہرہ ہوگیا کہ کمبخت دوزخی تھا جس کی جان
پاخانہ میں نکلی۔ اس کو تو جہنم نے بھی قبول نہ کیا ہو گا۔ مرُدود تھا......!
مرُدود......!! کیسی بدبختی کی موت تھی۔ بس لعنت تھی لعنت۔ حالانکہ وہی ایک قسم
کی موت تھی مگر ذرا سے فرق کے ساتھ ۔ ایک بہشتی مشہور ہوگیا اور دوسرا
دوزخی۔ تُعِزُّ مَنْ تَشَاءُ وَ تُذِلُّ مَنْ تَشَاءُ

## (86) موت کا فرشتہ تتیّے کی شکل میں

پانی پت میں ایک دِن میں دس بجے کے قریب شفاخانہ میں بیٹھا
بیماروں کو دیکھ رہا تھا کہ ایک کھانڈ کے تاجر لالہ صاحب گھبرائے ہوئے تشریف
لائے اور آتے ہی کہنے لگے کہ ’’بڑے بھائی صاحب کو چل کر دیکھ لیجئے اُن کو
لال زنبور (جسے تتیّا کہتے ہیں) نے کاٹ لیا ہے۔‘‘ میں نے کہا ’’پھر کیا ہوا؟‘‘
کہنے لگے ’’ذرا چلئے تو سہی وہ کچھ بیہوش سے بھی ہو گئے ہیں۔‘‘ مجھے علم تھا کہ
ان کی دوکان شفاخانہ سے کوئی سو گز کے فاصلہ پر ہے اور یہ مجھے لے جانے
کے لئے آئے ہیں ۔ تو معمولی بات نہیں ہے۔ غالبًا بڑے لالہ صاحب فوت
ہوچکے ہیں۔ خیر میں اسی وقت اُن کی دوکان پر پہنچا تو واقعی بڑے لالہ پر ان
چھوڑ چکے تھے ۔ میں نے اُن لوگوں سے کہہ دیا کہ ’’یہ تو فوت ہوچکے ہیں آپ
اب ان کی ارتھی کا بندوبست کریں ۔ مگر یہ تو بتاؤ کہ بات کیا ہوئی تھی۔؟‘‘ وہ
شخص کہنے لگا کہ ’’آپ جانتے ہیں ہماری دوکان میں کھانڈ ہی کھانڈ رہتی ہے
اور اُس پر ہزاروں بھڑیں اور زنبور (تتیّے) ہر وقت چمٹے رہتے ہیں جو ہم لوگوں



کو بھی روزانہ ڈنک مارتے رہتے ہیں۔ کوئی آٹھ روز کا ذکر ہے کہ بڑے لالہ کو
ایک زنبور نے کاٹ لیا۔ جس کے بعد اُن کو بخار چڑھ گیا۔ اور غفلت بھی ہو
گئی۔ سات دِن اور سات رات وہ بیمار رہے۔ نہ کھایا نہ پیا نہ ہوش آیا۔ کل
آہستہ آہستہ حواس قائم ہوئے۔ بخار بھی اُتر گیا۔ کچھ دُودھ وغیرہ بھی پیا۔ آج
صبح کہنے لگے کہ ’’میں تو دوکان پر جاتا ہوں۔ بہتیرا منع کیا باز نہ آئے۔ آخر
دوکان پر پہنچے۔ میں ساتھ تھا۔ دوکان کھولتے ہی کھانڈ کے ایک گھڑے کو
دیکھا۔ ایک زنبور اُس میں سے نکل کر سیدھا اُن کی ران میں چمٹ گیا۔ بمشکل
میں نے دھوتی ہٹا کر اُسے توڑ کر الگ کیا۔ یہ دیکھئے کہ اس کے کاٹنے کا نیلا
داغ اب بھی موجود ہے۔ زنبور کا کاٹنا تھا کہ اُسی وقت گر کر بیہوش ہو گئے۔
ایک لفظ بھی منہ سے نہ نکلا۔ آپ فرماتے ہیں کہ سرگباش ہو گئے۔ میں نے کہا
’’میں سمجھ گیا ان کے گردے کمزور تھے اور جسم میں سے زہر نکالنے کے قابل نہ
تھے۔ پہلی دفعہ تو بچ گئے تھے اَب کے چونکہ بہت زیادہ کمزور ہو چکے تھے اس
لئے ختم ہو گئے۔‘‘ لوگ کہنے لگے۔ ’’سانپ پر بیٹھا ہُوا زنبور ہو گا۔‘‘ میں نے
کہا ’’زنبور تو خاص طور پر زہریلا نہ تھا......! لیکن جسے کاٹا تھا وہ خاص طور پر
کمزور تھا۔‘‘

ان لوگوں کو بڑے لالہ کے مرنے کا یقین نہ آتا تھا لیکن میں بہرحال
ان سے کہہ کر چلا آیا کہ ’’یہ بیمار نہیں ہیں بلکہ مُردہ ہیں۔‘‘ دس بجے سے لے کر
شام کے پانچ بجے تک جتنے بھی شہر میں ڈاکٹر، حکیم، وید اور جنتر منتر پڑھنے
والے تھے آتے رہے اور اپنے اپنے علم کے جوہر دکھاتے رہے۔ مگر مردے بھی
کہیں زندہ ہوتے ہیں؟ آخر لاچار اور مایوس ہو کر ان کی ارتھی تیار کی اور
مرگھٹ کو لے چلے۔ راستہ میں میرا مکان پڑتا تھا۔ مرنے والے کے رشتہ دار
پھر آئے اور کہنے لگے کہ ’’آپ ہی سچے تھے مگر ہمارا دِل نہیں مانتا تھا۔ اب ان

کو جلانے کے لئے لے تو چلے ہیں لیکن ایک نظر پھر ان کو دیکھ لیں تو ہماری تسلی ہو جائے گی۔

میں نے باہر سڑک پر نکل کر ارتھی اُتروا کر دوبارہ نعش کو دیکھا اور یہی کہا کہ ''بھئی جاؤ اور اب تو ان کو چتا میں رکھنے کا وقت ہے۔ موت میں کوئی شبہ نہیں ہے۔'' اس پر وہ بچارے چلے گئے اور ارتھی کو مرگھٹ کی آگ کے سپرد کر دیا۔

## (87) جیل خانہ

جیل خانہ کا بھی ایک الگ عالم ہے۔ جہاں کے قواعد اور قوانین دنیا سے نرالے ہوتے ہیں۔ باہر والوں کے نزدیک تو وہ دوزخ ہے مگر اندر رہنے والے بعض لوگ اسے بہشت بھی سمجھتے ہیں۔ ڈاکٹر یا سپرنٹنڈنٹ کے طور پر میرا تجربہ یہی ہے کہ ہمارے جیل بہت بڑی اصلاح کے محتاج ہیں۔ خیر اصلاحات تو دُنیا میں ہمیشہ ہوتی ہی رہیں گی۔ مگر جیل کی زندگی ہوتی بڑی دلچسپ ہے یا قیدی اُسے دلچسپ بنا لیتے ہیں۔

جیل میں مجرم سزا یافتوں اور ملزم زیر مقدمہ لوگوں کی الگ الگ بارکیں ہوتی ہیں۔ جب تک لوگ بہ حیثیت ملزم جیل میں رہتے ہیں تب تک فطرتِ انسانی توبہ استغفار، دُعا، ذکر اور وِرد و وظائف کی طرف اُن کو مجبور رکھتی ہے۔ تسبیحیں کھٹکتی ہیں۔ ملزم نمازوں، آرتیوں اور مذہبی کتابوں کے پڑھنے میں مصروف رہتے ہیں اور عموماً ان کے مزاج میں رعونت اور شرارت نہیں ہوتی۔ پھر جب مقدمہ ہو چکتا ہے تو یا تو ملزم رِہا ہو جاتا ہے یا مجرم قرار پا کر قید ہو جاتا ہے۔ قیدی بنتے ہی وہ بالعموم سانپ کی طرح اپنی مصنوعی توبہ، نیکی اور خشوع خضوع کی کینچلی اُتار پھینک دیتا ہے اور چوبیس گھنٹہ کے اندر اندر



دوسرے پُرات مجرموں کے ساتھ مل کر ویسا ہی مفسد، ہنگامہ پرداز اور جرائم پیشہ بن جاتا ہے جیسے پرانے قیدی۔ یعنی قیدیوں کے کپڑے پہنتے ہی اس کا اندرونہ بھی یکدم بدل جاتا ہے۔ اور چند دِن کے اندر اُس کے شریفانہ چہرہ پر بداعمالی کی لعنت برسنے لگتی ہے۔ یہ لوگ اپنے لئے ایسا انتظام کر لیتے ہیں کہ افیون کھانے والے کے لئے اندر ہی افیون پہنچ جاتی ہے اور تمبا کو بیڑی، سگریٹ پینے والے کو یہ سب چیزیں وہیں مل جاتی ہیں۔ شراب، مٹھائیاں، نقدی برائے رشوت اور گڑ سب چیزیں باہر سے مہیا ہوتی رہتی ہیں۔ اور پرانے قیدی تو وہاں ایسی ہی خوش زندگی بسر کرتے ہیں جیسی وہ اپنے وطن میں کرتے تھے۔

لوٹ کھسوٹ، مار دھاڑ، چوری، مظالم سارے کام جیل کے اندر بھی اُسی طرح ہوتے ہیں جیسے باہر کی دُنیا میں، بلکہ زیادہ۔ اور بعض بدمعاشوں سے تو افسر بھی ڈرتے ہیں۔ مجھے سب سے عجیب تجربہ نشوں کے متعلق یہ حاصل ہُوا کہ ہمارے ملک میں بہت زیادہ لوگ افیم کھانے کے عادی ہیں اور تمباکو تو قریباً ہر شخص ہی پیتا ہے۔ (سوائے سکھوں کے) اور بہت سے نہ پینے والے بھی اندر جا کر تمباکو پینا شروع کر دیتے ہیں۔ قیدی کی زندگی چونکہ ایک نہایت باقاعدہ زندگی ہوتی ہے۔ یعنی محنت، مشقت، بروقت نپی تلی خوراک، سونا، کھانا، نہانا، رفع حاجت، ہر چیز ٹائم ٹیبل پر چلتی ہے۔ اور ذرا سی بھی تکلیف ہو تو ڈاکٹر، شفاخانہ، علاج اور پرہیزی کھانا اُن کے لئے موجود ہوتا ہے۔ اس لئے اُن کی صحت عموماً بہت اچھی ہو جاتی ہے۔ قیدی کو اپنے کپڑے پہننے کی اجازت نہیں سوائے جوتی کے جوڑا کے جو باہر کے رشتہ دار ہر ششماہی پر بھیج سکتے ہیں۔ اور اکثر ان جوتیوں کے تلوں کے اندر روپے اور ریزگاری وغیرہ سلی ہوئی ہوتی ہے۔ جب کوئی قیدی بھوک ہڑتال کرتا ہے تو اُسے فوراً الگ کوٹھڑی میں مقفل کر دیا جاتا ہے۔ وہ بھی جانتا ہے کہ چلتے پھرتے رہنے یا کام کرنے سے میں

جلد کمزور ہو کر بھوک محسوس کرنے لگوں گا اس لئے وہ بھی اپنا کمبل زمین پر بچھا کر مثل ایک پتھر کے بُت کے اپنے بستر پر لیٹ جاتا ہے اور کمبل اوڑھ کر بے حس و حرکت مُردہ کی طرح پڑا رہتا ہے۔ تاکہ اُس کی گرمی اور قوت ضائع نہ ہو۔ اکثر بھوک ہڑتال کرنے والے اپنا روزانہ کا کھانا تو واپس کر دیتے ہیں۔ مگر چُرا چھپا کر اور لوگوں سے روٹی لے کر کھاتے رہتے ہیں۔

بھوک ہڑتال والے کہتے ہیں کہ تین دِن تک تو سخت بھوک لگتی ہے پھر آہستہ آہستہ خواہش مرنی شروع ہو جاتی ہے اور ایک ہفتہ کے بعد بالکل مر جاتی ہے۔ پانی یہ لوگ باقاعدہ پیتے رہتے ہیں۔ مگر عموماً چند روز میں اُن کی صلح جیل والوں سے ہو جاتی ہے اور بھوک ہڑتال ٹوٹ جاتی ہے۔ جس میں اسٹرائیک کرنے والوں کو ہی 99 فیصدی شکست ہوتی ہے۔ جھک مار کر پھر کھانا کھانے لگ جاتے ہیں۔ ہر قیدی کے پاس لوہے کی بالٹی و دال سالن رکھنے اور پانی پینے کے لئے ہوتی ہے۔ جس کے کناروں کو اینٹ یا پتھر یا دیوار سے تیز کر کے وہ ایک دوسرے کی ڈاڑھیاں بھی مونڈ لیتے ہیں۔ یا لڑائی کے وقت مخالف کو زخم پہنچاتے ہیں۔ جیل کی مشقت میں بعض صورتیں تو جائز مشقت کی ہیں ۔ مثلاً باغیچہ کا کام، اور ہر طرح کی باعزت انڈسٹری ،مگر بعض ذلیل کُن ہیں۔ مثلاً چکی پیسنا، اور بعض بدبودار کام بھی ہیں۔ غذا کے متعلق پنجاب میں خاص کر تیل کا استعمال بہت شکایت کا موجب ہے کیونکہ اس ملک میں عموماً لوگ گھی کھانے کے عادی ہیں۔ سب سے زیادہ تکلیف دہ امر یہ ہے کہ اس قہری گرم ملک میں گرمی کے سارے موسم بھر ان لوگوں کو بند اور مقفّل بارکوں یا کوٹھڑیوں میں سونا پڑتا ہے جو ناقابلِ برداشت امر ہے۔ تعلیم کا کوئی انتظام نہیں۔ سوائے بورسٹل جیل کے۔ کپڑے عموماً بہت معمولی ہوتے ہیں۔



میری ملازمت کے پچھلے دس سالوں میں جیلوں کی قریباً کایا پلٹ گئی تھی ۔ مگر ابھی بہت سی تفاصیل محتاجِ اصلاح ہیں۔ جیل وارڈ اور پولیس کانسٹیبل کی ذہنیت میں کوئی فرق نہیں۔ اس لئے جن باتوں میں اُن کا کوئی فرد بدنام ہوتا ہے اُنہی باتوں میں اُن کے بھی بعض افراد بدنام ہیں۔

اب پھانسی کا حال سنیئے :- یہ ایک خشک کُنواں بارہ پندرہ فٹ گہرا پختہ بنا ہُوا ہوتا ہے اور اُس کے باہر اُونچا کر کے آڑا ڈنڈا لگا ہوتا ہے۔ جس میں پھانسی کا رسّہ پڑا ہوتا ہے۔ کنوئیں کا منہ دو تختوں سے ڈھکا ہُوا ہوتا ہے اور مجرم اُن پر کھڑا کیا جاتا ہے ۔ پھر گلے میں رسّے کا پھندا ڈال کر ایک ہینڈل کھینچ لیتے ہیں۔ جس سے وہ دونوں تختے کھل کر کنوئیں کی اندر کی طرف لٹک پڑتے ہیں۔ مجرم رسّے سے گردن کے بل معلّق ہو جاتا ہے اور دم گھٹ کر ایک دو منٹ میں اس کا کام تمام ہو جاتا ہے۔ پھانسی کے وقت اور دِن کی اطلاع مجرم کو پہلے سے نہیں دی جاتی۔ صرف ایک روز پہلے جب اُس کے عزیز اور رشتہ دار اُس سے ملنے آتے ہیں تب اُسے پتہ لگتا ہے کہ کل مجھے پھانسی ملے گی ۔ عموماً رات بھر وہ جاگتا رہتا ہے مگر بعض لوگ سوتے بھی رہتے ہیں۔ صبح کے قریب غسل کر کے تیار ہو جاتا ہے۔ پھر نیلے کپڑے پہنا کر اور ہاتھ رسّی سے جکڑ کر اُسے پھانسی کے کنوئیں کے پاس لے جاتے ہیں ۔

پھانسی کے اختتام تک قیدیوں کی بارکیں بند رہتی ہیں۔ مسلمان عموماً وہاں جاتے وقت ’’یا علی‘‘ کے نعرے لگاتے جاتے ہیں اور سکھ ’’ست سری اکال‘‘ کے اور سوائے ایک شخص کے جس نے عین وقت پر غل مچانا، منّتیں کرنا اور بھاگنا شروع کیا تھا۔ میں نے نہیں دیکھا کہ کسی عورت یا مرد نے اُس وقت کبھی شور و شر برپا کیا ہو۔ اور بعض مجرم تو اپنا یہ فرض سمجھتے ہیں کہ تختہ دار پر جرم کا اقرار کر لیں یا انکار۔ مگر بعض خاموشی سے آتے ہیں اور خاموشی کے ساتھ ہی

دنیا سے رخصت ہو جاتے ہیں۔ چنانچہ ایک شخص کے گلے میں جب رسّہ ڈالنے لگے تو اس نے پکارا کر کہا کہ ''بھائیو میں نے یہ خون کیا تھا۔'' اسی طرح ایک اور شخص نے پھانسی سے پہلے اعلان کیا تھا کہ ''میں نے یہ قتل نہیں کیا تھا میں مظلوم مارا جاتا ہوں۔'' عورتیں بھی پھانسی پاتی ہیں مگر بہت کم۔ اور یہ غلط مشہور ہے کہ عورت کو قانوناً پھانسی نہیں مل سکتی۔ ہاں نابالغ لڑکوں کو نہیں ملتی۔ وہ بورسٹل جیل میں اصلاح کے لے بھیجے جاتے ہیں۔ یہ بات بھی غلط ہے کہ جب پھانسی کا مقررہ وقت ٹل جائے تو پھر نہیں دی جاتی۔ مرنے کے بعد عموماً وارث اپنے مُردہ کی نعش لے جاتے ہیں۔ جس روز کسی کو پھانسی ملے اُس روز تمام دِن جیل پر ایک سناٹا اور خاموشی چھائی رہتی ہے۔

## (88) خدائی فیصلہ

شملہ کے علاقہ میں بہت سی چھوٹی چھوٹی ریاستیں ہیں۔ حتیٰ کہ اتنی چھوٹی بھی کہ وہاں کی آبادی پانچ سات مردوں سے زیادہ نہیں ہوتی۔ ایک چارپائی کے سرہانے راجہ صاحب بیٹھے ہیں اور پائینتی وزیر صاحب۔ جو ریاست کے فنانس ممبر، کمانڈر انچیف، ریونیو منسٹر، چیف جسٹس، غرض سب کچھ وہی ہوتے ہیں۔ چارپائی کے نیچے جو تین چار آدمی بیٹھے ہوتے ہیں وہ ریاست کی ساری رعایا ہوتے ہیں اور بس۔ مگر میں جس ریاست کا ذکر نے لگا ہوں وہ خاصی بڑی تھی۔ وہاں کی عدالت میں ایک نہایت اہم مقدمہ ایک پیتل کی گڑوی کا پیش ہوا۔ مدعی نے کہا کہ گڑوی میری ہے۔ ملزم نے کہا میری۔ بڈھا مدعی بولا کہ اگر مدعا علیہ اپنے بیٹے کے سر پر ہاتھ رکھ کر خدا کی قسم کھا جائے تو میں اپنا دعویٰ چھوڑ دیتا ہوں۔ عدالت نے یہ طریقِ فیصلہ منظور کر لیا۔ مدعا علیہ صاف قسم کھا گیا اور گڑوی اُٹھا کر مع اپنے بیٹے کے چلا گیا۔ غریب مدعی نے



بھی ایک ایسی نظر سے اُسے دیکھا جو بددُعاؤں سے بھری تھی۔ خیر عدالت ختم ہو گئی اور خدائی فیصلہ کا انتظار ہونے لگا۔ جھوٹا مدعا علیہ قسم کے ایک دو گھنٹہ کے بعد بیٹے سمیت اپنے گاؤں کی پگڈنڈی پر جا رہا تھا کہ یک دم بادل گھِر کر آنے شروع ہو گئے۔ پھر بارش آ گئی اور آخر میں بجلی کا کڑاکا۔ مگر ایسا کہ لوگوں نے برسوں سے ویسا ہولناک کڑاکا نہ سنا تھا۔ دوسرے دِن لوگوں نے بجلی سے جھلسی ہوئی دو لاشیں راستہ پر پڑی پائیں اور اُن میں سے ایک کے ہاتھ میں وہی گڑوی تھی جو کل عدالت کی میز پر رکھی ہوئی دیکھی گئی تھی۔

ایسے خدائی فیصلے ہمیشہ نہیں ہُوا کرتے مگر کبھی کبھی صرف بطور نمونہ اہلِ دنیا کو اس لئے دکھائے جاتے ہیں کہ وہ ایک مالکِ یوم الدین ہستی اور جزا و سزا کی مختارِ کُل عدالت پر ایمان رکھیں ورنہ دراصل یہ دنیا دارالجزا نہیں ہے۔

## (89) ضِدّی

کئی لوگ اپنی ہَٹ اور ضد کی وجہ سے بھی مر جاتے ہیں۔ میرے پاس سونی پت میں ایک مریض آیا جو نمونیہ سے بیمار تھا۔ خیر جب تک تو اُس کی حالت نازک رہی وہ بستر سے اُٹھ ہی نہیں سکا۔ مگر بخار اُترتے ہی بجائے پاٹ کے جو اسی مطلب کے لئے اُس کے پلنگ کے پاس رہتا تھا وہ شفاخانہ کے پاخانوں میں جو فاصلہ پر تھے پیشاب پاخانہ کے لئے اپنے پیروں چل کر جانے لگا۔ ملازمین نے بہتیرا روکا مگر باز نہ آیا۔ آخر میرے پاس رپورٹ ہوئی۔ میں نے اُسے تنبیہ کی کہ ''کسی دِن تو یک دم گر کر اور حرکتِ قلب بند ہو کر مر جائے گا۔ یہیں فراغت کر لیا کر۔ مہتر تو ہر وقت موجود رہتا ہی ہے ورنہ تیرے لئے اچھا نہ ہو گا۔ تجھے ابھی آٹھ دس دِن لیٹے رہنا ضروری ہے کہنے لگا ''چاہے

مروں یا جیئوں جب تک پران چلتے ہیں میں تو باہر ہی جاؤں گا۔'' چونکہ معاملہ اہم تھا میں نے اُسے پھر سمجھایا اور وہ کچھ کچھ مان بھی گیا۔ مگر وقت آنے پر اُس کی ضد پھر عود کر آئی۔ دوسرے دِن وارڈ قلی میرے پاس دوڑا ہُوا آیا کہ وہ شخص اپنے بستر کے پاس گر کر مر گیا ہے۔ کہنے لگا کہ ''وہ رفع حاجت کے لئے اُٹھ کر باہر جانا چاہتا تھا۔ میں نے بہتیرا اُسے منع کیا مگر باز نہ آیا۔ دو قدم ہی پلنگ سے پرے گیا ہوگا کہ تیورا کر گرا اور وہیں ٹھنڈا ہو گیا۔''

## (90) حکیم صاحب کی حکمت

گڑ گاؤں کے سول ہاسپٹل میں ایک متقی نیم حکیم میرے زیر علاج شفاخانہ میں داخل تھے۔ ایک دِن میرے ہمسائے ڈسٹرکٹ انجینئر نے کچھ جنگلی کبوتر ہمارے کھانے کے لئے بھیجے جنہیں حکیم صاحب نے بھی دُور سے دیکھ لیا۔ تیسرے پہر کو حکیم صاحب میرے دروازے پر آ کر کراہنے لگے۔ میں جو باہر نکلا تو دیکھا کہ وہ باقاعدہ ذبح شدہ مرغ کی طرح تڑپ رہے ہیں۔ میں نے گھبرا کر پوچھا کہ ''حکیم جی! کیا ہوا'' کہنے لگے ''مر گیا۔ میری ہڈی ہڈی میں سردی داخل ہو گئی ہے۔ او جان نکلنے لگی ہے مجھے بچاؤ۔'' میں نے کہا ''کیا وجہ؟'' کہنے لگے ''یہ جو شفاخانہ کے احاطہ میں اِملی کا درخت ہے میں غلطی سے آج اُس کے نیچے کئی گھنٹے لیٹا رہا۔ اس درخت کی تاثیر حکیموں نے زمہریر لکھی ہے۔ دوسرے لوگوں کو تو کوئی نقصان نہیں پہنچا مگر میں کمزور تھا کلیجہ کو سردی چڑھ گئی ہے۔ اور دانت سے دانت بجنے لگا ہے۔ ہائے کیا کروں۔ اُوئی مر گیا۔ ہائے ہڈیوں کا گودا بھی ٹھنڈا ہو گیا۔'' میں نے پوچھا ''آخر اس کا کیا علاج ہو سکتا ہے۔؟'' بے دھڑک فرمانے لگے کہ: ''اب تو صرف کبوتر کا شوربا ہی میری موت کو روک سکتا ہے۔'' اس وقت میں حکیم جی کی حکمت کو سمجھا۔ میں



نے کہا۔ ''آج آپ کی قسمت سے ہمارے ہاں کبوتر ہی پک رہے ہیں آپ تسلی رکھیں۔'' چنانچہ وہ تو اُس وقت لرزتے کانپتے اور جزاک اللہ کہتے ہوئے اپنے بستر پر شفاخانہ میں چلے گئے اور میں نے شام کو ایک کبوتر مع شوربے کے اُن کو بھیج دیا۔ دوسرے دِن کہنے لگے کہ ''میں کل دُنیا سے رخصت ہی ہو جاتا اگر وہ کبوتر میرے پیٹ میں نہ جاتا۔'' میں نے کہا کہ ''آپ نے ضرور اُن کبوتروں کو ہمارے ہاں لاتے ہوئے انجینئر صاحب کے نوکر کو دیکھ لیا ہوگا۔'' وہ تو چپ ہو گئے مگر ایک کمپاؤڈر پاس سے بول پڑا کہ ''دیکھا کیوں نہیں تھا۔؟ اُن کبوتروں نے ہی تو اِن کو املی کے نیچے بٹھا کر لرزہ چڑھایا تھا۔ اور انہوں نے ہی پھر ان کو شفا بخشی تھی۔ ہاں اتنی بات ہے کہ ان کو اس بیماری کا نسخہ یاد تھا ورنہ خدا جانے کیا ہوتا۔''

## (91) امیروں کے نخرے

لاہور کا ذکر ہے کہ ایک سیٹھ کو بواسیر یعنی (فسچولا) کا مرض ہو گیا۔ بیماری بغیر آپریشن کے اچھی نہیں ہوتی۔ جب بیماری کے دورے بار بار تکلیف دینے لگے تو سیٹھ صاحب نے مجبور ہو کر آپریشن پر رضامندی ظاہر کی۔ پہلے تو وہ ڈاکٹر ہیرا لال صاحب کے پاس گئے اور اُن سے معاملہ طے کرنے لگے۔ اُنہوں نے دیکھ کر کہا کہ ''ہاں آپریشن ہو جائے گا مگر آپ سے ہزار روپیہ فیس لوں گا۔'' سیٹھ صاحب اس رقم کو زیادہ خیال کر کے وہاں سے چلے آئے۔ یار دوستوں سے صلاح مشورہ کیا۔ پھر کرنیل ہیوگو صاحب کے پاس گئے۔ انہوں نے کہا ''ہاں میں ضرور آپریشن کر دوں گا۔'' سیٹھ صاحب نے پوچھا ''اور فیس؟'' صاحب نے کہا ''سو (100) روپیہ کافی ہو گا'' سیٹھ صاحب بہت خوش ہوئے اور دِن اور وقت کا فیصلہ کر کے آ گئے۔ جب

آپریشن کے لئے کرنیل صاحب اُن کے گھر پر آئے اور آپریشن کے لوازمات تیار ہو گئے تو سیٹھ صاحب کو یہ وہم پیدا ہُوا کہ انگریز کا کیا اعتبار؟ خدا جانے کیا کاٹ کر رکھ دے۔ یہ تسلی کیونکر ہو گی کہ آپریشن ٹھیک ہُوا ہے یا نہیں! یہ خیال آتے ہی انہوں نے ایک آدمی ڈاکٹر ہیرا لال صاحب کے پاس بھیج کر اُن کو بلایا اور کہا کہ ’’ہمارا ارادہ تو کرنیل صاحب سے ہی آپریشن کرانے کا ہے لیکن تسلی آپ کے بغیر نہیں ہوتی۔ آپ صرف چند منٹ کھڑے ہو کر اتنا دیکھ لیں کہ آپریشن ٹھیک ہو گیا ہے یا نہیں؟ جیسا اپنے ہم وطن پر اعتبار ہو سکتا ہے ویسا دوسرے پر نہیں ہو سکتا۔ فرمایئے اس تھوڑی سی دیر کے یہاں کھڑے ہونے کی آپ کیا فیس لیں گے؟‘‘ ڈاکٹر صاحب نے فرمایا ’’ہزار روپیہ‘‘ سیٹھ صاحب کہنے لگے۔ ’’صاحب نے ایک سو روپیہ آپریشن کا لیا ہے۔ آپ اُن سے زیادہ کس طرح لے سکتے ہیں؟‘‘

ڈاکٹر ہیرا لال کہنے لگے ’’یہ آپ کی مرضی ہے خواہ مجھ سے آپریشن کرائیں خواہ آپریشن کے وقت مجھے کھڑا کر لیں اور کام کچھ نہ لیں فیس ایک ہی ہو گی!‘‘

سیٹھ صاحب کے دِل میں تو خوف اور ڈر کا چور تھا بہت قیل و قال کے بعد مجبوراً راضی ہو گئے۔ غرض آپریشن ہو گیا۔ کرنیل صاحب نے ڈاکٹر صاحب سے کہا کہ ’’سیٹھ صاحب آپ کے دوست معلوم ہوتے ہیں؟ ڈاکٹر صاحب نے کہا کہ ’’اصل میں پہلے یہ مجھ سے آپریشن کرانا چاہتے تھے۔ میں نے ہزار روپیہ طلب کیا تھا مگر سو روپیہ پر آپ نے اِن کا آپریشن کر دیا لیکن اعتبار تو ان کو مجھ پر تھا اس لئے بلا کر کھڑا کر لیا ہے اور اس کھڑے ہونے کی فیس بھی میں نے ہزار روپیہ ہی لی ہے۔‘‘

صاحب ہنس کر کہنے لگے کہ ’’پھر تو ہم ہی خسارہ میں رہے‘‘ ڈاکٹر



صاحب نے کہا ’’نہیں میں آپ کو بھی تین سو (300) دلواؤں گا۔ تسلّی رکھیں‘‘ چنانچہ آپریشن کے بعد صاحب نے مطالبہ کیا اور ڈاکٹر صاحب نے اُن کی تائید کی کہ سو (100) روپیہ ایسے کام اور ایسے سیٹھ کے لئے بہت تھوڑی رقم ہے‘‘ چنانچہ تین سو روپیہ صاحب کو اور ہزار روپیہ ڈاکٹر صاحب کو دیے گئے اور پیچھے روزانہ مرہم پٹی کے لئے جو باضابطہ خرچ ہوتا رہا وہ الگ۔

ایسے وہم بھی امارت کے کھیل ہیں۔

## (92) مُلتانی منگواؤں؟

ملتان کے علاقہ میں مغرب کی پہاڑیوں سے وہ مٹی نکلتی ہے جسے گاچنی یا ملتانی مٹی کہتے ہیں اور جسے چھوٹی جماعتوں کے طالب علم اپنی تختیوں پر ملا کرتے ہیں۔ اس طرف کے اضلاع میں دستور ہے کہ جب کسی صاحب ثروت کے لڑکے کا بیاہ ہو کر بہو گھر میں آ جاتی ہے تو سب گھر والے نئی دلہن کے متعلق ماں بننے کا انتظار بیاہ کے چند دِن کے بعد ہی شروع کر دیتے ہیں۔ بڑے لالہ صاحب اپنی گھر والی سے روزانہ باقاعدہ پوچھتے رہتے ہیں کہ ’’کہو بہو کا کیا حال ہے، ملتانی مٹی منگواؤں؟‘‘ آخر کسی روز اُن کے گھر والی بھی کہہ دیتی ہے کہ ’’آثار تو معلوم ہوتے ہیں، اب منگا لیں‘‘ چنانچہ پانچ سات روز کے بعد ایک اونٹ جس پر قریباً چھ من ملتانی مٹی لدی ہوئی ہوتی ہے گھر پر آ جاتا ہے۔ اور وہ ملتانی اُن کی بہو کے سرہانے بوریوں میں بھر کر رکھ دی جاتی ہے۔ مطلب اس ساری بات کا یہ ہوتا ہے کہ ماشااللہ بہو کو حمل ہے۔ اس کا جی ضرور مٹی کھانے کو چاہتا ہو گا۔ اگر خوشبودار سوندھی سوندھی ملتانی مٹی اُسے ہر وقت خواہش کے وقت نہ ملے گی تو اُس کی اور بچہ کی صحت پر بُرا اثر پڑے گا۔ اس علاقہ میں تو حاملہ عورتیں منوں مٹی حمل کے دوران میں کھا جاتی ہیں، اور ان

کو سکھایا بھی یہ جاتا ہے کہ یہ بہت مفید چیز ہے۔ ساتھ ہی خود حاملہ عورتوں کو بھی اس قسم کی فضول چیزوں کی طرف رغبت ہُوا کرتی ہے۔ بس پھر کیا تھا کوئی حد ملتانی مٹی کھانے کی نہیں رہتی۔ میں نے دیکھا ہے کہ بعض عورتوں کا رنگ اس طرح بکثرت مٹی کھا کھا کر ملتانی کی طرح کا ہی ہو جاتا ہے، اور بجائے فائدہ کے اُن کو سراسر نقصان ہی پہنچتا ہے۔ یہ صرف ایک رواج ہے اور فائدہ کی نسبت اس میں نقصان بہت زیادہ ہے۔

## (93) عادت کا اثر صحت پر

میڈیکل کالج لاہور میں ہمارے ساتھ یو-پی کے ایک طالب علم بھی ڈاکٹری پڑھنے داخل ہوئے۔ آدمی تھے دھان پان مگر طرّار۔ پچھلی ساری عمر تو اس طرح گزری تھی کہ آٹھویں دسویں دِن گرم پانی سے نہایا کرتے تھے۔ لاہور میں آئے تو کسی ڈاکٹر کا لیکچر سنا کہ ”روزانہ سرد پانی سے نہانا نہایت مفید ہے“ بس اسی بات کو پلّے باندھ کر لے دوڑے اب ہر شخص کو تبلیغ کر رہے ہیں کہ ”بھائی روزانہ ٹھنڈے پانی سے نہایا کرو، اس سے صحت بہت اچھی رہتی ہے“ لوگوں نے کہا کہ ”آپ خود بھی تو نہایا کریں!“ کہنے لگے ”واقعی مجھے تو سب سے پہلے اس پر کاربند ہونا چاہئے تھا۔“ غرض انہوں نے اپنی پرانی عادت توڑ کر یکدم روزانہ باسی پانی سے نہانا شروع کر دیا اور وہ بھی علی الصبح اندھیرے منہ۔ سردی کا موسم قریب تھا۔ دسمبر کے مہینے میں بھی اُن کا یہ عمل جاری رہا اور ساتھ ہی اُن کی لیکچر بازی سرد پانی سے غسل کے متعلق تیز تر ہو گئی۔ چند دِن وہ کالج میں نظر نہ آئے۔ دریافت کرنے پر معلوم ہُوا کہ بیمار ہیں پھر سنا کہ نمونیہ ہو گیا ہے۔ پھر مشہور ہُوا کہ ڈبل نمونیہ ہے جو بھی اُن کی عیادت کو جاتا وہ اُن سے یہی کہتا کہ ”یہ سرد پانی سے نہانے کا نتیجہ ہے“



غرض مرمر کے اچھے ہوئے تو اُنہیں بھی یقین آ گیا کہ واقعی میں نے بڑی غلطی کی کہ ٹھنڈے پانی سے روزانہ نہاتا رہا شکر ہے کہ جان بچ گئی مگر خدا جانے کتنے لوگ میرے پراپیگنڈے سے متاثر ہو کر اور ٹھنڈا غسل کر کے بیمار ہوئے ہوں گے اور شاید کوئی مر بھی گیا ہو۔ چنانچہ اُن کے گھنٹے کا پنڈولم دوسری طرف زیادہ چلا گیا اور شفا پاتے ہی پہلے پراپیگنڈے کے بالکل برخلاف اُن کی تبلیغی مساعی شروع ہوگئیں۔ اب ہر شخص کو منع کرتے پھرتے ہیں کہ ”باسی اور ٹھنڈے پانی سے نہانا محض خودکشی ہے۔ میں نے خود تجربہ کر کے دیکھ لیا ہے۔ یہ بڑی خطرناک عادت ہے۔ اگر ڈبل نمونیہ سے مرنا منظور ہو تو بے شک جاڑے میں سرد پانی سے غسل کیجئے وغیرہ وغیرہ۔ غرض وہ اُن لوگوں میں سے تھے جو میانہ رو اور معاملہ فہم نہیں ہوتے بلکہ محض جذباتی ہوتے ہیں نہ وہ مختلف حالات کے ماتحت مختلف اور مناسب حکم لگاتے ہیں۔ نہ موقع اور محل دیکھتے ہیں، بلکہ ایک ہی ڈنڈے سے سب کو ہانکنا جانتے ہیں۔ ایسے لوگ جب کسی بات کی موافقت میں تبلیغ کرتے ہیں تب بھی وہ خطرناک ہوتے ہیں اور جب مخالف میں بولتے ہیں تب بھی خطرناک ہوتے ہیں۔

## (94) آواز کا کھیل

غالباً عید کے بعد ٹرّ کا میلہ تھا کہ میں امرتسر میں مع چند عزیزوں کے رام باغ گیٹ کے پاس میلہ کے تنبوؤں کے قریب سے گزرا۔ وہاں ایک تنبُو پر لکھا دیکھا کہ ”یہاں انسانی کھوپڑی باتیں کرتی ہے اور سوالوں کا جواب دیتی ہے“ ٹکٹ شاید ایک آنہ یا دو آنہ کا تھا۔ ہم اندر گئے تو دیکھا کہ ایک آدمی انسان کی کھوپڑی لے کر بیٹھا ہے اور جو سوال کرو کھوپڑی باریک آواز سے اُس کا جواب دیتی ہے۔ چنانچہ ہم نے کئی سوال کئے اور اردو فارسی اشعار بھی

اس کھوپڑی سے پڑھوائے۔ میرے ساتھی نہایت حیران ہوئے کہ بات کیا ہے؟ زمین یا کسی نلکی سے اس کھوپڑی کا تعلق نہیں تھا۔ پھر کون ہے جو اس میں باتیں کرتا ہے؟ آخر یکدم مجھے خیال آیا کہ یہ وہ علم ہے جسے ونٹری لوکوئزم (VENTRI LOQUISM) کہتے ہیں یعنی انسان آواز کی مشق کر کے اس طرح بات کر سکتا ہے کہ بات خود اس کے منہ سے نکلتی نہیں معلوم ہوتی بلکہ جس مقام سے چاہے اُس کے بولنے کی آواز وہیں سے آتی معلوم ہوتی ہے۔ مثلاً اگر بولنے والا مشاق چاہے تو اس طرح کلام کر سکتا ہے کہ اُس کا کلام کمرہ کی ایک کرسی یا کتاب یا لیمپ میں سے نکلتا ہُوا سنائی دے نہ کہ خود اس کے منہ سے۔ ایک آدمی آپ کے سامنے بات کرتا ہے مگر آواز آپ کی پشت کی طرف سے آتی معلوم ہوتی ہے۔ جس طرح روشنی کی شعاعیں ریفلیکٹر کے ذریعہ جس جگہ اور جس طرف سے بھی چاہیں پھیر سکتے ہیں اسی طرح خاص طرف سے منہ بنا کر بولنے کی مشق کرنے سے کسی کمرہ میں سے کسی مقررہ جگہ سے بولنے والے کی آواز آنے لگتی ہے۔ چنانچہ یہ کھیل بھی وہی تھا اور تماشا والے نے آخر مان لیا کہ بات یہی تھی۔ جب ہم نے اُسے کہا کہ کوئی فارسی کا شعر پڑھو تو پڑھنے والا تو وہی تماشا گر تھا مگر آواز اس کھوپڑی میں سے آتی تھی کہ

الا یا ایہا الساقی ادر کاساً و ناولہا
کہ عشق آسان نمود اوّل ولے افتاد مشکلہا

ہر شخص اس قسم کی پریکٹس میں کامیاب نہیں ہو سکتا مگر کوشش اور مشق کے ساتھ بعض آدمی اس کے ماہر ہو جاتے ہیں اور اپنے ہمراہیوں کو خوب ڈرا لیتے ہیں۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ کوئی جن تکیہ میں سے یا لوٹے میں سے دیوار میں سے باتیں کر رہا ہے، مگر آواز بہت اونچی اور صاف نہیں ہوتی۔ اس علم کی



کتابیں انگریزی کتب فروشوں کے ہاں ملتی ہیں اور اس فن کو ونٹری لوکوئی (VENTRI LOQUY) کہتے ہیں اور یہ آواز کو فوکس کرنے کا فن ہے مگر بہت دلچسپ۔ جب ہم نے تماشا والے کو کہا کہ ''قرآن کریم پڑھ کر سنوائے'' تو اُس کھوپڑی نے سورۂ یٰس کی کچھ آیتیں پڑھیں، پھر شاید سنسکرت یا کوئی اور غیر زبان بولنے کو کہا تو فیل ہو گئی کیونکہ وہ اس بولنے والے کو خود نہیں آتی تھی۔

## (95) دُکانداری

ایک سرحدی ضلع میں ایک ڈاکٹر صاحب کہیں سے تبدیل ہو کر تشریف لائے۔ اُن کے ساتھ اُن کا ایک رشتہ دار بھی تھا۔ وہ جہاں جاتے تھے اسے ہمراہ لے جایا کرتے تھے اور ایک ڈرگ شاپ یعنی دوا فروشی کی دکان اُسے کھلوا دیتے تھے لیکن پبلک کو پتہ نہ لگتا تھا کہ ڈاکٹر صاحب کو اس دکان سے کوئی تعلق ہے۔ سمجھوتہ یہ تھا کہ ڈاکٹر صاحب اپنے ہر نسخہ یا ہر متمول مریض کے نسخہ میں باقی سب معمولی اور مشہور دوائیاں مکسچر کی لکھ کر آخر میں بجائے پانی کے اِکوا سُہانجنا (AQ. SOHANJNA) بھی لکھ دیا کرتے تھے۔ شفاخانہ کا کمپونڈر نسخہ دیکھ کر کہہ دیتا کہ ''ہمارے ہاں یہ دوا نہیں ہے بازار سے نسخہ بنوا لیں'' پھر مریض جس جس کیمسٹ کے پاس جاتا تو وہ بھی نسخہ پڑھ کر یہی کہہ دیتا کہ ''یہ دوا پڑھی نہیں جاتی'' یا ''سمجھ میں نہیں آتی'' یا ہمارے ہاں موجود نہیں ہے آپ کہیں اور سے نسخہ بنوا لیں'' پھرتا پھراتا آخرکار جب نسخہ والا اُس خاص کیمسٹ کے پاس پہنچتا جو ڈاکٹر صاحب کا آوردہ تھا تو وہ فوراً نسخہ بنا دیا کرتا تھا۔ اس طرح سے نہ صرف کیمسٹ کے گاہک زیادہ ہوتے جاتے تھے بلکہ ڈاکٹر صاحب کا کمیشن یا منافع بھی ترقی کرتا جاتا تھا اور بات صرف اتنی تھی کہ سہانجنا ایک مشہور درخت ہے جس کی پھلیوں کا اچار پنجاب میں عام طور پر استعمال ہوتا

ہے۔ مگر انگریزی دوا فروش اس کے نام سے ناواقف ہوتے ہیں اس لئے سہانجنا کا عرق صرف اسی دکان پر ملا کرتا تھا اور ڈاکٹر صاحب بھی اُسے مریض کے فائدہ کے لئے نہیں لکھتے تھے بلکہ صرف اپنے فائدہ کے لئے۔

اسی طرح کاایک قصہ اور بھی مشہور ہے کہ جب دہلی کے ایک مشہور عطّار نے اپنی دکان کھولی تو انہوں نے حکیم محمود خاں صاحب دہلوی سے کہا کہ ''میری سرپرستی فرمائیے۔آپ کی ذراسی توجہ سے میری دکان چل پڑے گی'' حکیم صاحب نے کہا ''اچھا تم بازار سے کچھ دوائیں اور ایک ٹین کا بمبالا کر اُس میں پانی بھر کر دُکان میں رکھ چھوڑو۔میں جب کسی نسخہ میں عرق بمبا کا لفظ لکھا کروں تو تم اس بمبے کا پانی ہمراہ دیگر ادویہ کے دے دیا کرو اور آمدنی کی طرف سے بے فکر ہو جاؤ''۔

چنانچہ وہ صاحب حکیم صاحب کی مہربانی کی وجہ سے درجہ اوّل کے عطّار بلکہ حکیموں کے بھی استاد بن گئے۔دونوں کہانیوں میں فرق یہ ہے کہ وہ ڈاکٹر صاحب بدنیّت تھے اور خود کمیشن لیتے تھے مگر حکیم محمود خاں صاحب کو کمیشن کا خیال بالکل نہ تھا بلکہ ایک سمجھدار اور لائق شخص کی دکان کو ترقی دینے کا اور محض اس کی ہمدردی کا خیال تھا۔

## (96) کوکین

کوکین کھانے کا رواج ہندوستان میں پہلی جنگ عظیم سے کئی سال پہلے کا شروع ہے مگر اب کم ہو گیا ہے کیونکہ جنگ کے زمانہ میں اس کی درآمد مشکل ہے۔ بمبئ، کلکتہ، اجمیر، دہلی اس کے مرکز اور صدر مقام تھے۔ یہ عموماً پان میں رکھ کر کھائی جاتی ہے اور پنواڑی لوگ جب عام پان بنا کر گاہک کو دیتے تھے تو کہا کرتے تھے کہ یہ ایک پیسہ والا پان ہے اور جب کوکین والا



دیتے تھے تو کہا کرتے تھے یہ تین آنہ والا ہے۔

یہ دہلی 1911ء کی بات ہے۔ میں دربار ڈیوٹی پر اس سال وہیں متعین تھا۔ اجمیر کا ایک کوکین خور بھی اس مکان میں تھا۔ اس نے بازار سے کوکین والے کئی پان کھائے تو لازماً منہ سُن ہو گیا۔ پھر گھر میں آ کر اس نے سادے اور عام پان کھانے شروع کئے اور ساری رات ہی کھاتا رہا۔ میرے اندازے میں کوئی سو پان کھائے ہوں گے۔ نتیجہ یہ ہُوا کہ منہ ہونٹ اور زبان سب سوج گئے اور صبح ہوتے ہوتے وہ چارپائی پر اوندھا منہ کئے پڑا تھا اور رال منہ سے بہہ رہی تھی۔ کئی دِن میں جا کر اُس کی یہ سوجن اور ورم اُترا۔

تاجروں نے لاکھوں روپیہ اسی کوکین کی تجارت سے کمایا اور بطور رشوت رنڈیوں کو دیا تا کہ وہ امراء کو کوکین کھانا سکھائیں۔ کوکین میں بے ہوشی والا نشہ نہیں ہوتا۔ پرانے عادی اپنی عادت پوری کرنے کے لئے اِسے کھاتے ہیں۔

دِلّی میں ایک سوداگر تھے جو صرف میاں بیوی تھے اور اولاد نہ رکھتے تھے۔ انہوں نے اس کی تجارت شروع کی۔ لاکھوں کا فائدہ ہوا۔ کئی مکان بنا لئے۔ آخر ایک دِن یہ خیال آیا کہ جس چیز نے اتنا مالی فائدہ اور برکت دی ہے اُسے خود بھی کھا کر دیکھیں۔ غرض اس طرح اُن کا نشہ شروع ہوا۔ پھر بیوی کو بھی ساتھ شامل کر لیا۔ رفتہ رفتہ دماغ کی تیزی اور عقل کم ہوتی گئی۔ کاروبار ابتر ہوتا چلا گیا۔ آخر میں سب جائداد اور اندوختہ کوکین پر ہی برباد ہو چکا تھا۔ بوڑھے میاں بیوی خبطیوں کی طرح گھر میں پڑے رہا کرتے تھے اور ہفتہ میں دو دفعہ بازار سے سیر بھر بالائی لا کر کھا لیا کرتے تھے بس یہی اُن کی غذا تھی۔ آخر اسی حالت میں نیم دیوانہ ہو کر دُنیا سے گزر گئے۔

کوکین عجیب عجیب طرح غیر ملکوں سے آیا کرتی تھی۔ کبھی قینچیوں اور

چاقوؤں کے بکسوں اور پارسلوں کی تہوں کے اندر رکھی ہوتی۔ کبھی سوئیوں، لیموں اور دیگر مالِ تجارت کے اندر مخفی طور پر پوشیدہ ہوتی۔ پھر خوردہ فروشی میں دہلی آ کر بھی نہایت احتیاط سے بکتی تھی۔ اگر آپ کو ایک چھ آنہ کی پُڑیا درکار ہوتی تو آپ کوکین کے ایجنٹ سے براہ راست نہیں لے سکتے تھے۔ بلکہ بعض برقعہ پوش عورتیں یہ کام کرتی تھیں جو پیسے لے لیتی تھیں اور کہہ دیتی تھیں کہ ''فلاں مکان کے دروازے کے پاس دیوار کی ایک اینٹ اُکھڑی ہوئی ہے اُس رخنہ میں ایک پتھر کے نیچے چھ آنے والی ایک پُڑیا دبی رکھی ہے وہ جا کر لے لو'' یہ کام بہت خطرناک تھا کیونکہ پولیس بھی بلائے بے درمان کی طرح دِن رات اس گروہ کے پیچھے لگی رہتی تھی۔

کوکین کھانے سے نہ صرف منہ اور گلا سن ہو جاتا ہے بلکہ سارا بدن ہی سُن معلوم ہونے لگتا ہے۔ علاوہ ازیں اس میں سرور بھی ہوتا ہے جیسے بھنگ یا شراب وغیرہ میں، مگر جب زیادہ مقدار میں کھاتے رہیں اور عادت پرانی ہو جائے تو بھوک پیاس مر جاتی ہے۔ بدن کی کھال خشک ہو جاتی ہے اور اس قدر اس میں خارش رہتی ہے کہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کپڑوں کے اندر پِسّو پُھر پُھرا رہے ہیں یا کھٹمل چل رہے ہیں۔ اس تکلیف کی وجہ سے نیند جاتی رہتی ہے۔ آدمی کبھی ایک حِصّہ بدن کو نوچتا ہے کبھی دوسرے کو بالآخر پاگل ہونے تک نوبت پہنچ جاتی ہے۔

ہندوستان میں اس کی عادت عیّاش لوگوں کی آوردہ ہے اور مشہور معجون فلک سیر کا بھی یہ ایک جزو ہُوا کرتی تھی۔ جس کی عادت کی وجہ سے دِلّی کے سینکڑوں عیّاش اور رئیس زادے تباہ اور برباد ہو گئے۔ کوکین آنکھ، ناک وغیرہ کے آپریشنوں کے وقت ان کو بے حِس کرنے کے کام آتی ہے۔ پھر کلوروفارم کی ضرورت باقی نہیں رہتی اور یہی اس کا اصل فائدہ ہے۔



ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ پنجاب میں کسی جگہ کوکین پکڑی گئی۔ جب کیمیکل ایگزامینر کے ٹیسٹ ہونے گئی تو واقعی کوکین ثابت ہوئی۔ مجرموں کو سزا مل گئی اور کوکین ضبط ہو کر شفاخانوں میں آپریشنوں کے لئے تقسیم کر دی گئی۔ یہ پچیس تیس سال کا واقعہ ہے۔ مگر آپ سُن کر حیران ہوں گے کہ میں جب بھی اس کوکین کو کسی مریض کی آنکھ میں ڈالتا تھا تو آنکھ بے حس نہ ہوتی تھی۔ آخر تنگ آ کر وہ پُڑیا میں نے صاحب کیمیکل ایگزامینر کے پاس بھیجی کہ اِسے ٹیسٹ کر دیں۔ آیا اِس میں کوکین ہے یا نہیں؟ وہاں سے جو جواب آیا وہ مجھے بعینہٖ اب بھی یاد ہے اور ہدیۂ ناظرین ہے:

"NOT A SINGLE PARTICLE COCAIN WAS FOUND IN THE POWDER SENT BY YOU"

''یعنی تم نے جو پوڈر ہمیں بھیجا ہے اس میں کوکین کا ایک ذرہ تک موجود نہیں ہے۔''

تعجب ہے کہ ایک مقدمہ چلے، وہ چیز کوکین ثابت ہو۔ ملزم بھی سزا پا جائیں۔ پھر دوسری دفعہ وہی پوڈر کوکین ثابت نہ ہو۔ العجب! ثُمّ العجب! شاید یہ بات ہو کہ وہ پہلی چیز کوکین ہی ہو مگر پھر مقدمہ کے بعد کسی حاجتمند نے اُسے اُڑا لیا ہو اور اُس کی جگہ بورک ایسڈ رکھ دیا ہو واللہ اعلم۔

## (97) بیویوں کے نوکر

ایک دِن میں رہتک کا زنانہ شفاخانہ دیکھنے گیا۔ خود شفاخانہ میں تو حسب ضرورت جانا ہی پڑتا تھا مگر اتوار کو جو چھٹی کا دِن ہوتا ہے دیگر متعلقہ سرکاری مکانات اور عام صفائی وغیرہ بھی دیکھی جاتی ہے۔ عملہ کے مکانات

دیکھتے دیکھتے مَیں زنانہ کمپاؤڈر کے مکان میں بھی گیا۔ وہ ایک عیسائی عورت تھی جس کے تین چار بچّے تھے۔ اندر جا کر میں نے اُس سے پوچھا کہ ''یہ کون ہیں؟'' اُس نے کہا ''یہ میرے بچے ہیں'' میں نے پوچھا ''اور یہ؟'' وہ بولی ''یہ میرے ہسبنڈ ہیں'' (یعنی خاوند) میں نے پوچھا ''یہ بھی کچھ کام کرتے ہیں؟'' کہنے لگی ''اِن کے لئے گھر کا کام ہی بہت کافی ہے۔ جھاڑو صفائی، سودا لانا، کھانا پکانا، برتن صاف کرنے، بچوں کو نہلانا دُھلانا وغیرہ'' میں نے کہا ''اور ان باتوں کا معاوضہ؟'' ہنس کر کہنے لگی کہ ''جب میں شفاخانہ سے دوپہر کو کھانا کھا کر سو جاتی ہوں اور اپنا کوٹ اُتار کر کیلوں پر لٹکا دیتی ہوں تو یہ میرے کوٹ کی جیب میں سے ضرور کچھ نہ کچھ چوری کر لیا کرتے ہیں'' اس کا خاوند بھی ہمارے ساتھ ہنسی میں شریک ہو گیا اور کہنے لگا ''کسی طرح گزارا جو کرنا ہوا۔ آخر سگریٹ کہاں سے پئیں؟'' میں نے عموماً ہندوستانی عیسائی عورتوں کو دیکھا ہے کہ وہ مشن کی امداد کی بدولت اچھی تعلیم حاصل کر لیتی ہیں۔ کوئی لیڈی ڈاکٹر بن جاتی ہے۔ کوئی اسکول مسٹرس، کوئی لیڈی ہیلتھ وزیٹر، کوئی نرس دائی، مگر اسی کلاس کے عیسائی مردوں کا یہ حال ہے کہ اگر وہ کہیں عہدہ پر پہنچ جائیں تو یوریشین یا یورپین بیوی ڈھونڈتے ہیں۔ اگر خود یوریشین ہوں تو ولایت سے دلہن لاتے ہیں۔ اس حالت میں ان کے برابر درجہ والی عیسائی عورتوں کے لئے ان کی ٹکّر کا خاوند ملنا محال ہو جاتا ہے نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ یا تو وہ ساری عمر کنواری ہی بیٹھی رہتی ہیں یا پھر انہیں اسی قسم کے گھٹیا خاوند مل سکتے ہیں جو بَیرے اور خانساماں کا کام دیں، ان کے بچوں کو پالیں مکان کو صاف رکھیں اور تھوڑے سے جیب خرچ یا چوری چکاری کے معاوضہ میں ان کے گھر کو آباد رکھیں۔ یہ بیویاں اپنے خاوندوں کو خوب ڈانٹتی ڈپٹتی ہیں اور ان کو بہت ذلیل حالت میں رکھتی ہیں کیونکہ یہ نکھٹو ہوتے



ہیں اور اکثر ان میں سے چال چلن کے لحاظ سے بھی۔ سگریٹ نوش، شرابی، جواری، تاش کھیلنے والے اور آوارہ ہوتے ہیں اور جونک کی طرح اپنی بیویوں کی آمدنی کا خون چوستے رہتے ہیں۔

سوسائٹی وہی آرام دہ ہے جس میں مرد کے ذمہ عورت اور بچوں کے جملہ اخراجات ہوں اور مرد کماؤ ہو نہ کہ عورت۔ جب عورت کمانے لگتی ہے تو اس کا اپنا خاوند اس کی نظر میں حقیر اور ذلیل ہو جاتا ہے اور اس بات کا اولاد کی ذہنیت پر بہت بُرا اثر پڑتا ہے۔

## (98) ہیجڑوں کی کرامت

1905ء ذکر ہے کہ میں پہلی دفعہ ملازم ہو کر دہلی میں متعین ہوا۔ گرمی اس سال سخت پڑی اور بارش کے ہونے میں اس قدر کھینچ ہو گئی کہ زمین العطش العطش پکارنے لگی۔ ہندوؤں نے غرباء کے لئے لنگر کھول دیے اور مسلمانوں نے فیصلہ کیا کہ نماز استسقاء پڑھی جائے چنانچہ پہلے روز حنفی جمع ہو کر جنگل میں گئے۔ نماز استسقاء پڑھی، چادریں اُلٹا اُلٹا کر دعائیں مانگیں اور آ گئے۔ دوسرے دِن اہل حدیث اسی طرح گئے اور وہی عمل کر آئے۔ تیسرے دِن شیعہ گئے اور بارش کی دُعا مانگ کر آ گئے۔ غرض روزانہ کوئی نہ کوئی فرقہ جاتا اور خدا سے بارش مانگتا مگر ناکام آ جاتا۔ غالباً ساتواں دِن تھا شہر میں غل مچ گیا کہ آج ہیجڑے بارش مانگنے جا رہے ہیں۔ چنانچہ یہ لوگ جمع ہو کر دس بجے شہر سے باہر نماز کے لئے گئے اور بارہ بجے موسلا دھار مینہہ برساتے اور بھیگتے ہوئے واپس آئے۔ شہر میں مبارک سلامت کا شور برپا ہو گیا۔ لوگوں نے یہی کہا کہ اس درگاہ میں عاجزی اور انکساری پسند ہے اسی وجہ اس فرقہ کی دُعا فوراً قبول ہوئی۔ باقی سب مولوی، عالم، لمبی

داڑھیوں والے اپنے دین پر یا اپنی قبولیت پر یا اپنے حسب نسب پر فخر کرنے والے اور متکبّر تھے کسی فرقہ میں سچا انکسار نہ تھا مگر ہیجڑے بیچاروں کو کس بات پر فخر ہوسکتا تھا؟ وہ عاجزی اور فروتنی لے کر گئے تھے اور ابرِ رحمت برساتے آئے۔

## (99) پگڑیوں پر ڈاکہ

ایک دفعہ میں لائلپور سے لاہور کی طرف ریل میں سفر کر رہا تھا۔ گرمی کا موسم اور قریباً چھ بجے شام کا وقت تھا۔ گاڑی دو اسٹیشنوں کے درمیان اپنی پوری تیز رفتاری کے ساتھ جا رہی تھی۔ سب ڈبّوں کی کھڑکیاں کھلی تھی اور لوگوں کے سر کچھ کچھ کھڑکیوں سے باہر نکلے ہوئے تھے تاکہ ہوا لگتی رہے کہ اتنے میں یکدم کھڑکھڑ کرتی ہوئی کوئی چیز ٹرین سے رگڑ کھاتی گزر گئی۔ میں نے باہر جھانک کر دیکھا کہ چند زمیندار نوجوان لمبے لمبے بانسوں میں بیری کی خاردار ٹھنیاں باندھ کر انہیں ٹرین کی کھڑکیوں کے ساتھ لگا رہے تھے۔ نتیجہ یہ ہُوا کہ دو تین درجن پگڑیاں، کلاہ اور ٹوپیاں ان بیری کے کانٹوں میں الجھ کر اور مالکوں کے سر پر سے اتر کر زمین پر جا پڑیں۔ زمینداروں نے پھرتی کے ساتھ اس مال غنیمت کو سمیٹنا شروع کیا اور ہمارے دیکھتے دیکھتے ففرو ہو گئے اور قیمتی دستاروں والے اپنی قسمت کو رونے لگے کیونکہ گاڑی پوری رفتار میں تھی۔ کئی بھلے مانس ننگے سر رہ گئے اور بہتوں کے چہروں اور گردنوں پر ان چھاپوں کی وجہ سے خراشیں بھی آ گئیں۔ کئی پگڑیاں مشہدی ریشمی تھیں اور کئی کلاہ دس دس پندرہ پندرہ روپے قیمت کے بھی تھے اور بحیثیت مجموعی تو وہ مال غالباً سینکڑوں روپے کا تھا۔ معلوم ہُوا کہ کئی دِن سے یہ کھیل اس علاقہ میں کھیلا جا رہا تھا مگر ابھی تک اس کو غالباً مذاق یا نوجوانوں کی چھیڑخانی ہی تصور کیا جاتا تھا۔ کیونکہ کوئی



کوشش اِن بدمعاشوں کے پکڑنے کی پولیس نے نہ کی تھی۔ زیادہ سے زیادہ مجھے یہ نظر آیا کہ جن لوگوں کا نقصان ہُوا تھا وہ یا تو گالیاں دے رہے تھے یا اپنی قسمت کو رو رہے تھے یا صبر سے بیٹھے اپنی گردنوں اور سروں کو سہلا رہے تھے۔ غرض ایک مضحکہ خیز ڈراما تھا جو ان دیہاتیوں نے ڈاکہ مار کر ٹرین کے مسافروں کو دکھایا جس سے ناظرین بھی ہنسے اور ڈاکو بھی قہقہے لگاتے چلے گئے۔

## (100) سانگلہ ہل

سانگلہ ایک قصبہ شیخوپورہ کے ضلع میں واقع ہے۔ اس کے اسٹیشن کا نام سانگلہ ہل[1] مشہور ہے اور ریل کے ٹائم ٹیبل میں بھی اس کا یہی نام درج ہے۔ پنجاب کا یہ علاقہ ایسا سخت گرم ہے کہ وہاں گرمیوں میں گویا آگ برستی ہے۔

ایک دفعہ وہاں کے ہائی اسکول کے لئے اخبارات میں یہ اشتہار نکلا کہ ایک ہیڈ ماسٹر کی ضرورت ہے جو لائق اور تجربہ کار ہو اور انگریزی کا مضمون خاص طور پر اچھا پڑھا سکتا ہو۔ وہ اشتہار کسی انگریزی اخبار میں ایک بنگالی بابو کی نظر سے بھی گزرا جو غالباً کلکتہ میں رہتے تھے۔ بیچارے ایم-اے تھے۔ غریب تھے اور ساتھ ہی نیم مسلول بھی۔ اور لوگوں کی طرح انہوں نے بھی اس جگہ کے لئے عرضی دے دی اور خیال یہ کر لیا کہ نہ صرف گزارہ چل جائے گا بلکہ ہل اسٹیشن (HILL STATION) (یعنی پہاڑی صحت افزا مقام) ہونے کی وجہ سے میری بیماری پر بھی اچھا اثر پڑے گا۔ ادھر یہ ہُوا کہ اسکول کے منتظمین کے پاس جتنی درخواستیں آئی تھیں ان سب میں اس بنگالی کی درخواست بہترین قرار دی گئی کیونکہ اس کی ڈگریاں بھی زیادہ تھیں اور غالباً

[1] ہل (Hill) کے معنی انگریزی میں پہاڑ یا پہاڑی کے ہیں۔

تجربہ بھی۔ غرض اسی کو بُلا لیا گیا۔ اِس پر بنگالی بابو نے جھٹ پٹ پہاڑ کے موسم کے مطابق گرم جوڑے تیار کروا کر اپنا سفر پنجاب کی جانب شروع کر دیا۔ لاہور پہنچنے کے بعد وہ سانگلہ ہل والی گاڑی میں بیٹھے اور ہر اسٹیشن پر پوچھنا شروع کیا کہ سانگلہ ہِل کتنی دُور ہے؟ غرض اسی طرح سفر کرتے آخر سانگلہ سے ورلے اسٹیشن تک پہنچ گئے اُس وقت مسافروں نے کہا کہ ''لیجئے اب اگلا اسٹیشن سانگلہ ہل ہے'' مہینہ مئی یا جون کا تھا اور دوپہر کا وقت۔ مسافروں کے ہر بُن مُو سے پسینے بہہ رہے تھے اور گرمی کے مارے ٹرین کے ڈبے تنور کی طرح تپ رہے تھے کہ سانگلہ کے قریب آ جانے کا نام سُن کر بنگالی بابو نے اپنا ٹرنک کھولا اور جلدی جلدی بنیان، سویٹر، گرم پتلون اور جرابیں پہن کر اُوپر سے ایک موٹا اوورکوٹ چڑھا لیا، پھر گلوبند گردن کے گرد لپیٹ کر منزلِ مقصود کی راہ تکنے لگے۔ ڈبہ کے مسافر حیران تھے کہ یہ شخص بیمار ہے یا دیوانہ؟

آخر سانگلہ ہل تو آ گیا مگر ٹھنڈک نہ آئی، نہ پہاڑی سرد ہوا۔ نہ سبزہ نہ بارش ''ارے باپ رے باپ یہ کیسا ہل اسٹیشن ہے؟'' اتنے میں ایک اُستاد اور کئی لڑکے اسکول کے جو نئے ہیڈ ماسٹر کو لینے کے لئے آئے تھے پہنچ گئے۔ تھرمامیٹر ایک سو بیس درجہ پر! اور اُوپر سے لباس وہ جس کا ذکر گزر چکا ہے۔ بمشکل گرمی سے ہانپتے ہوئے بنگالی کو درجہ میں سے کھینچ کر نکالا گیا۔ اسباب اُتروایا اور لڑکے کہنے لگے کہ ''چلئے شہر کو'' لیکن وہاں نہ موٹر تھا نہ تانگہ نہ ٹُم ٹُم۔ اسی گرمی اور اسی لباس میں بچارے بنگالی بابو کوئی ایک فرلانگ بھی پیدل نہ چلے ہوں گے کہ گرمی کے مارے بے ہوش ہو گئے۔ لڑکے چارپائی پر ڈال کر اُن کو شفاخانہ لے گئے تو معلوم ہُوا کہ ہیٹ اسٹروک (Heat Stroke) ہے۔ سب کپڑے اُتار دیے گئے۔ پانی کے ٹب میں اُن کو لٹا دیا گیا۔ سر پر برف رکھی گئی تب کہیں جا کر شام تک ہوش و حواس دُرست ہوئے۔ ہوش میں آتے ہی



فرمانے لگے کہ ''بابا ہم تو اِسے ہل اسٹیشن سمجھ کر آیا تھا مگر ایسے ہل اسٹیشن کی ہمیں خبر نہ تھی جہاں ہیٹ اسٹروک ہو جائے۔ ہم تو ایک دِن بھی یہاں رہنا نہیں مانگتا۔ غرض دو تین دِن میں کچھ صحتیاب ہو کر وہ سیدھے کلکتہ واپس بھاگے اور طلبہ کو اپنی حالت پر ہنستا چھوڑ گئے۔ بعض ناموں میں بھی بہت دھوکا ہوتا ہے۔

## (101) ہردوار

ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ میں نے اپنی صحت کی خاطر پورے ایک سال کی رخصت لی۔ ایک دِن خیال جو آیا تو ہردوار کا ٹکٹ لے کر سیدھا اس کعبۂ اہلِ ہنود میں پہنچ گیا اور ریل سے اُتر کر دریا کے کنارے اُن سیڑھیوں پر جہاں لوگ نہا رہے تھے جا پہنچا۔ ایک پنڈت جی دوڑے ہوئے آئے اور ہاتھ جوڑ کر میرے سامنے کھڑے ہو گئے کہ ''مہاراج! یہاں آپ نہ کھڑے ہوں یہاں تو صرف ہندو ہی اشنان کر سکتے ہیں۔ ہَر کی پَوڑی دیکھنی ہے تو سامنے والے جزیرہ پر آ جائیں وہاں سے آپ کو سب کچھ دکھائی دے گا''۔

خیر مَیں نے اُن کے کہنے پر عمل کیا۔ دیکھا کہ دریا کے کنارے چند سیڑھیاں ہیں جو پانی میں اُترتی ہیں اور لوگ اُن پر بیٹھ کر نہاتے ہیں اور اسی مقام کو ہَر کی پَوڑی یعنی خدا کی سیڑھی کہتے ہیں، پھر وہ شخص مجھ سے کہنے لگا کہ ''ہم یہاں کے مہنت یعنی عبادت کرانے والے پنڈت ہیں۔ آپ آج ہمارے مہمان ہیں آیئے میں آپ کو ساری جگہ کی سیر بھی کرا دوں اور پھر آپ کا کھانا بھی جیسا ہو گا ہمارے ہی ذمّہ ہے'' میں نے کہا ''اچھا'' غرض اُس نے گنگا کے اس کنارے کے دُور دُور تک مجھے سیر کرائی اور جب ایک بج گیا تو ایک مسلمان کی دُکان پر مجھے بٹھا کر تھوڑی سی دیر میں خود ایک خوان

میں کھانا لے آیا۔ کھانا یہی پوری کچوری اچار وغیرہ تھا مگر ہر چیز پتھر کے برتنوں میں تھی، یہاں تک کہ پینے کا پانی بھی ایک پتھر کے گلاس میں تھا۔ میرا دِل اُس کی اِس مہمان نوازی سے بہت خوش ہوا۔ جو خاص چیز میں نے وہاں دیکھی وہ یہ تھی کہ اشنان کرنے والے لوگ دُور دُور تک دریا کے کنارے بیٹھ کر نہاتے تھے۔ صرف ہَر کی پَوڑی کے ساتھ غسل مخصوص نہ تھا مگر اکثر ان میں سے نہاتے وقت دریا میں کچھ نہ کچھ نقدی ڈال دیتے تھے، چونکہ دریا کا یہ حِصّہ منبع کے نزدیک ہے اس لئے پانی کے نیچے مٹی یا ریت نہ تھی بلکہ دریا کی ساری تہہ میں گول گول پتھر ہی پتھر تھے۔ ایسے پتھروں میں پیسہ، اکنّی یا دونیّ کا دستیاب ہونا نہایت مشکل ہے لیکن وہاں سینکڑوں کی تعداد میں ایک قوم تھی جو پانی کے اندر ہاتھ ڈال کر اور اِسے ہلا کر کسی نہ کسی طرح جو بھی سکّہ اِن پتھروں کے اندر ہوتا تھا نکال لیتی تھی۔ میں نے دیکھا کہ ہر دس پانچ منٹ کے بعد وہ کبھی دونیّ، کبھی پیسہ، کبھی چونیّ اپنی اِس حکمت عملی سے نکال ہی لیتے تھے۔ ایک تماشا یا مصیبت وہاں یہ بھی دیکھی کہ ایک مارواڑی دریا کے کنارے اپنے کپڑے اُتار کر نہانے لگا۔ صدری اُس نے سامنے ایک درخت سے ٹانگ دی اور دھوتی کَس کر پانی میں گھس گیا۔ اتنے میں ایک بندر آیا اور اُس کی صدری درخت پر سے لے کر چلتا ہوا۔ سیٹھ صاحب کا رنگ یہ دیکھ کر فق ہو گیا۔ چیخیں مارتے پانی میں سے بھاگتے ہوئے نکلے اور بندر کے پیچھے دوڑے مگر وہ کہاں ہاتھ آتا تھا۔ ایک مکان سے دوسرے مکان پر اور ایک چھجے سے دوسرے چھجے پر چھلانگیں مارتا چلا گیا اور پیچھے پیچھے سیٹھ صاحب کہتے جاتے تھے کہ ’ارے کوئی پکڑنا اِس صدری میں میرے دس ہزار کے نوٹ ہیں‘‘۔ لوگ بہت کچھ بھاگے دوڑے مگر بندر کا پتہ بھی نہ لگا۔ یہ دیکھ کر سیٹھ جی کی ایسی حالت ہوگئی کہ بس دیکھنے سے ہی تعلق رکھتی تھی۔ کئی دفعہ اُنہوں



نے انعام بھی رکھا کہ ’’سو روپیہ دوں گا‘‘۔ دو سو روپیہ دوں گا‘‘ مگر بندر بھلا کس کے ہاتھ آتا تھا۔ یہ کام تو صرف بندوق ہی کر سکتی تھی لیکن تیرتھ میں بندوق کا کیا کام۔ غرض میں تو اُسے اِسی طرح پیٹ پکڑے روتا پیٹتا چھوڑ کر چلا آیا کیونکہ واپسی کا وقت ہو گیا تھا۔ خدا کو معلوم ہے کہ اُس صدری یا بندر کا پھر کیا حشر ہُوا اور سیٹھ صاحب زندہ بچے یا دس ہزار روپیہ کے غم میں سرگباش ہو گئے۔

## (102) سرکس میں سرکس

لاہور کا ذکر ہے کہ ایک دفعہ وہاں ایک مشہور سرکس آیا۔ جس روز میں دیکھنے گیا اُس دِن ساری سیٹیں بھری ہوئی تھیں۔ تِل رکھنے کو کہیں جگہ نہ تھی۔ سامنے تیسرے درجہ کی گیلری میں لوگ اس قدر پھنسے بیٹھے تھے کہ اُن کے لئے سانس لینا بھی مشکل تھا اور وہاں سے تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد گھنگروؤں کی چھن چھن کی آواز بھی آ رہی تھی، معلوم ہُوا کہ ضلع شاہ پور کے بعض شوقین شکاری اپنے شکاری بازوں کو ہاتھوں پر لئے بیٹھے ہیں اور یہ آواز اُن گھنگروؤں کی ہے جو بازوں کے سروں میں پڑے ہوئے ہیں۔

خیر تماشا شروع ہُوا اور جب آدھ گھنٹہ کے قریب ہو چکا تو تیسرے درجہ کی گیلری میں جہاں بازوں والے شکاری بیٹھے تھے یک دم ایک شور اُٹھا، پھر گالم گلوچ اور آخر میں مار کٹائی اور لکڑیاں چلنے کی آوازیں آنی شروع ہو گئیں۔ لوگ اتنے کھچ مچ اور پھنسے ہوئے بیٹھے تھے کہ نہ سامنے اُتر سکتے تھے نہ کسی طرف کو جا سکتے تھے، نہ گیلری کے نیچے جو خالی جگہ تھی اُس میں کود کر باہر بھاگ سکتے تھے۔ گالیوں کے ساتھ ساتھ لکڑیاں پٹنے کی آواز بھی بلند ہوتی گئی۔ کوئی کہتا تھا کہ ’’میرا سر پھٹ گیا ہے‘‘ کوئی اپنے چہرہ پر سے خون پونچھتا تھا

مگر سب سے بلند اور اونچی آواز یہ تھی کہ ''دیکھنا میرے باز کو چوٹ نہ لگے ہزار روپے کا باز ہے۔ مجھے بیشک مار لے مگر دیکھنا باز کا نقصان نہ ہو''۔ اُدھر فریق ثانی چاہتا تھا کہ اِن بازوں کو ہی فنا کردے کیونکہ قصور باز کا تھا نہ کہ باز والے کا۔

اِسی جھگڑے میں پولیس آ گئی۔ لڑنے والے پکڑے گئے اور وہ سارا لشکر تھانہ کی طرف بھیجا گیا تو اصل حال کھلا۔

بات یہ ہوئی کہ ایک ریلوے کا کلرک جو بیس (20) روپیہ کا ملازم تھا اُس نے اُس سال اپنی تنخواہ میں سے بچا بچا کر اور اپنا پیٹ کاٹ کاٹ کر اتنی رقم جمع کی کہ جاڑے میں اپنے لئے ایک گرم کوٹ بنا سکے۔ وہ کوٹ بہت خوبصورت کشمیرے کا تھا اور اسی دِن درزی کے ہاں سے سِل کر آیا تھا۔ بابو اس کوٹ کو پہن کر فخریہ سرکس کے منڈوے میں داخل ہوا، اور گیلری کی ایک بنچ پر تماشا دیکھنے بیٹھ گیا۔ اُس سے اُوپر کے بینچ پر باز والے شکاری بیٹھے تھے۔ جب تماشا شروع ہُوا اور لوگوں نے ہر کرتب کے بعد تالیاں پیٹنی شروع کیں تو باز گھبرائے اور بار بار شکاریوں کے ہاتھوں پر حرکت کرنے اور پھڑ پھڑانے لگے جس کی وجہ سے اُن کے گھنگروؤں کی آواز بعض دفعہ اتنی بلند ہوتی تھی کہ نزدیک کے لوگ سرکس کا تماشا کرنے والوں کی باتیں نہیں سُن سکتے تھے۔ اِس پر پہلے تو آہستہ آہستہ تُو تُو مَیں مَیں شروع ہوئی، مگر ابھی معاملہ اس سے آگے نہ بڑھا تھا کہ ایک باز نے اِس زور سے اپنی بیٹ کی پچکاری اُس ریلوے بابو کی طرف شُوٹ کی کہ بچارا سر سے پیر تک چھینٹم چھینٹ ہو گیا اور وہ اعلیٰ درجہ کا کوٹ جو مدتوں کی تمناؤں اور پیسہ پیسہ جمع کر کے اُس نے ایک فیشن ایبل درزی سے سلوایا تھا اور اُسی دِن پہلی دفعہ پہن کر اپنے گھر سے سیدھا سرکس میں آیا تھا گردن سے لے کر نیچے تک سفید داغوں سے آلودہ اور افشاں



ہو گیا، بلکہ ٹوپی، گردن، چہرہ اور کوٹ سبھی تر بتر ہو گئے۔ غریب بابو تو اِس صدمہ سے قریب المرگ ہو گیا مگر اُس کے ساتھیوں نے اپنی لکڑیاں سنبھال لیں اور جنگ شروع ہو گئی۔ بازدار لوگ چونکہ اپنے ہاتھوں پر بازوں کو بٹھائے ہوئے بلکہ باندھے ہوئے تھے وہ سوائے اس کے کہ یہ الفاظ بار بار چیخ کر کہیں کہ ''دیکھنا ہزار روپے کا باز ہے اِسے چوٹ نہ لگے'' اپنے تئیں بچا نہ سکتے تھے، مگر ریلوے بابو کی تو ساری پونجی، سارا حُسن، ساری زینت تباہ ہو چکی تھی اُس کے اور اُس کے ساتھیوں کے حملے برابر جاری رہے۔ آخر اس ڈر سے کہ کہیں کوئی باز اِس معرکہ میں کام نہ آ جاوے وہ بازدار مجبور ہو کر بنچوں کے درمیان میں سے گیلری کے نیچے کود گئے اور جان سلامت لے کر بھاگے، مگر پھر بھی یہ دنگہ فساد اتنا بڑھا کہ پولیس کو مداخلت کرنی پڑی بلکہ بیس پچیس منٹ کے لئے سرکس والوں کو بھی اپنا تماشا بند کرنا پڑا۔ جب وہ سب لوگ پولیس کی حراست میں تھانہ انارکلی کی طرف دفعہ 147 کے ماتحت پکڑے جا کر وہاں سے رخصت ہوئے تو پھر تماشا دوبارہ شروع ہو سکا، اور سرکس کے اندر جو ایک دوسرا سرکس شروع ہو گیا تھا اُس سے امن مِلا، مگر پھر بھی باقی لوگوں میں آخر تک یہ بحث جاری رہی کہ قصور کس کا تھا؟ اُن کا جو بازوں کو اندر لائے تھے یا اُن کو جو بازوں کو دیکھ کر پھر بھی اُن کے زیرسایہ تماشا دیکھنے بیٹھ گئے تھے؟ مگر ایسی باتوں کا نہ تو کبھی فیصلہ ہُوا ہے نہ ہو گا لیکن مجھ پر اس واقعہ کا یہ اثر ہُوا کہ جب انسان کسی مجلس میں جائے تو اسے ایسی جگہ بیٹھنا چاہئے جو (CUT OF THE LINE OF FIRI) آتشیں لائن کی زد سے الگ ہو۔

## (103) کیمیاگر

پہلے کیمیاگر چاندی سے سونا بنانے کے دعویدار تھے، پھر یہ لوگ

سونے کے زیور کو ہی دوگنا چوگنا کرنے لگے اور حال کے کیمیا گر تو نوٹوں کو دوگنا کرنے کے مدعی ہیں، مگر یہ سب ایک ہی تھیلی کے چٹے بٹے ہیں۔ ہمیشہ ایسے اشخاص کوئی نہ کوئی بیوقوف شکار پھانس لیتے ہیں اور اُس کا روپیہ یا زیور بڑھانے یا دُگنا کرنے کے بہانے ٹھگ کر خود چنپت ہو جاتے ہیں اور اُس بیوقوف کو روتا چھوڑ کر دوسروں کے لئے عبرت بنا جاتے ہیں، مگر اکثر لوگ پھر بھی اصل معاملہ کو نہیں سمجھتے اور یہی کہتے رہتے ہیں کہ صرف یہ فقیر ٹھگ اور بے ایمان تھا مگر کیمیا تو برحق عِلم ہے ہی۔ سُنیئے تو سہی بُزرگ لوگ کیا فرماتے ہیں ۔

کیمیا و سیمیا و رِیمیا
کس نداند جُزْ بذاتِ اولیا

حالانکہ اصل یہ ہے کہ کیمیا تو ہے مگر یہی جس کا نمونہ یہ ٹھگ دکھا جاتے ہیں اور چند گھنٹے کے اندر سینکڑوں روپیہ کا مال ہضم کر جاتے ہیں اور دوسرے طالبوں کو بھی سِکھا جاتے ہیں کہ بس یہی ترکیب ہے۔ تم بھی اسی طرح لوگوں کا مال خُرد بُرد کر لیا کرو اور یہی کیمیا کا نسخہ ہے، مگر لوگ اُس کیمیا کے طالب ہیں جو دُنیا میں موجود نہیں اور جو ہے اُس پر عمل نہیں کرتے۔ بس اِتنا سا فرق ہے اور ذرا سا سمجھ کا پھیر ہے ورنہ وہ کیمیا ساز تو سچ مچ کامیابی سے اپنا فن دکھا بھی جاتے ہیں اور سکھا بھی جاتے ہیں۔

میرے ایک بزرگ تھے اُن سے جو شخص بھی یہ ذکر کرتا کہ ”مجھے کیمیا بنانی آتی ہے آپ مجھ سے سیکھ لیں“ تو وہ یہی فرمایا کرتے تھے کہ ”بڑی مہربانی ہو گی اگر آپ خود ہی سیر دو سیر سونا بنا کر اس میں سے صرف پاؤ بھر مجھے دے دیں باقی خود خرچ میں لے آئیں۔ آپ کے ہوتے مجھے سیکھنے کی کیا ضرورت ہے۔ میری ضروریات کے لئے تو آپ کا دیا ہُوا پاؤ بھر سونا بھی بہت کافی ہے“



ایسے جواب کے آگے کوئی کیمیا گر بھلا کہاں ٹھہر سکتا ہے؟ بس خاموشی سے منہ لٹکائے واپس چلا جاتا تھا۔ اِس تمہید کے بعد میں ایک اصلی واقعہ اسی کیمیا گری کا سُنا دیتا ہوں۔

میرا ایک عزیز ایک دفعہ میرے پاس روتا ہُوا آیا۔ میں نے کہا ”کیا ہوا“؟ کہنے لگا ”میں تو لُٹ گیا بلکہ اِس سے بھی زیادہ کیونکہ میرے اپنے مال کے سوا دوسروں کا بھی کچھ مال میں نے قرض لیا تھا وہ بھی ساتھ ہی لے گیا“۔ میں نے پوچھا ”آخر کیا ہوا، معاملہ تو بتاؤ؟“ بچارے کی غم کے مارے گھگی بندھی ہوئی تھی۔ بڑی مشکل سے اُس نے بتایا کہ ”مجھے مدتوں سے کیمیا کی دھت لگی ہوئی تھی۔ کُشتے اور بھٹیاں لگاتے لگاتے جو اندوختہ تھا وہ رفتہ رفتہ ختم ہو گیا۔ پھر نوکری کی وہ بھی بے حیثیت مگر اس میں سے دس آنہ فی روپیہ اِسی شوق کی نذر ہوتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ نہایت سخت تنگی سے گزران ہوتی تھی۔ تین چار دِن ہوئے ایک فقیر آیا نہایت معتبر بلکہ بزرگ صورت، اور آتے ہی تصوف کے چند کلمات اور کچھ چکنی چپڑی مؤثر باتیں سُنائیں، ایسی کہ میں تو مسحور ہو گیا۔ رات کو وہ میرے ہاں ہی ٹھہرا۔ وظیفے اور نمازیں پڑھتا رہا۔ صبح کو اُس نے میرے ہاتھ پر ایک ٹکڑا سونے کا رکھ دیا کہ ”مجھے مفت خورہ مہمان مت سمجھو، میں غریب نہیں ہوں۔ خدا تعالیٰ نے بڑے بڑے علم سکھائے ہیں۔ ازاں جملہ ایک کیمیا کا عِلم بھی ہے جو خاص وراثت اولیاء کی ہے یہ ٹکڑا سونے کا لو اور فروخت کر کے میرے لئے فلاں فلاں چیزیں خرید کر لا دو“ میں تو پہلے ہی کُشتۂ کیمیا تھا، سونا دیکھتے ہی رال ٹپک پڑی سُنار کے ہاں وہ ٹکڑا فروخت کیا۔ اُس نے بھی کہا کہ ”یہ سونا اتنا کھرا ہے کہ کبھی شاذ و نادر ہی بازار میں ایسا آتا ہے“ بس پھر کیا تھا میں تو شاہ صاحب کا مرید ہو گیا۔ اور ایسی عاجزی کے ساتھ اُس نسخہ کا طلبگار ہُوا جتنی عاجزی کبھی ساری عمر خدا تعالیٰ کے آگے بھی نہ

کی تھی۔ خیر اُسے بھی رحم آ گیا اور کہنے لگا کہ ''فی الحال ایک چونیّ لے آ'' میں
لے آیا ''اُس نے اُس پر کچھ دوا لگائی، کچھ چھڑکی، پھر اُسے آگ میں رکھ دیا۔
تین گھنٹے کے بعد مجھے بُلا کر میری ہتھیلی پر خالص سونے کی ایک چونی رکھ دی
جس پر وہی تصویر اور وہی سنہ تھا جو اصلی چونیّ پر تھا۔ اب تو میرے پیٹ میں
چُوہے دوڑنے لگے۔ غریبی، پرانی دھت، پہلی ناکامیابیاں اور آنکھوں کے
سامنے ایک بزرگ صفت آدمی کا سونا بنا کر دکھا دینا۔ غرض میں اُس شخص کا
بندۂ بے دام ہو گیا۔ شاہ صاحب بھی کچھ کچھ ہاں ہوں کرنے لگے۔ آخر یہ
فیصلہ ٹھہرا کہ کم از کم دو سو (200) روپیہ کا زیور چاندی کا ہو یا چاندی روپیہ کی
ہی صورت میں جمع کی جائے تاکہ پہلا گھان سونے کا تیار ہو سکے۔ اس کے
بعد یہ عمل سِکھا بھی دیا جائے گا۔ میں سُنتے ہی گھر کو دوڑا اور غریب ماں کے
زیور کا صندوقچہ اُڑا لیا۔ اُس کے علاوہ میرے اپنے پاس کچھ روپے تھے وہ
لئے، پھر ایک دو محلے والوں سے پچاس کے قریب روپے قرض لے کر سب کو
شاہ صاحب کے حوالہ کیا اور اُنہوں نے ایک بھٹی گھر کی بیٹھک میں چڑھا دی
جو رات بھر گرم رکھی جاتی تھی۔ مجھ سے شاہ صاحب نے کہا کہ ''تم بھی رات کو
یہاں آ جانا'' میں نے کہا ''مجھے آپ پر کامل اعتبار ہے اور رقم معمولی ہے اور
میری والدہ گھر میں اکیلی ہے میں صبح ہی حاضر ہوں گا'' رات بھر مجھے خوشی کے
مارے نیند نہیں آئی ڈھائی سیر پختہ سونا! خالص سونا! یعنی دو سو (200) روپیہ
کے بدلے پانچ ہزار روپیہ نقد اور نسخہ الگ!!! صبح ہوتے ہی باہر نکلا تو شاہ
صاحب کے کمرہ کی کنڈی اندر سے لگی ہوئی تھی۔ بہتیرا کھٹکھٹایا۔ شاہ صاحب کو
آوازیں دیں مگر کوئی نہ بولا۔ آخر دیوار پھاند کر باہر کی طرف سے گیا تو نہ شاہ
صاحب، نہ روپیہ، دونوں میں سے کسی کا نشان تک نہ تھا۔ البتہ بھٹی ٹھنڈی پڑی
ہوئی میری قسمت کو رو رہی تھی۔ بہت دوڑ بھاگ کی کچھ پتہ نہ ملا۔ اب بوڑھی



ماں کو غش پر غش آ رہے ہیں اور لوگ اپنے قرضہ کا تقاضا کر رہے ہیں اور مجھ
پر ہر جگہ لعنت ملامت پڑ رہی ہے، بتائیے کیا کروں؟

میں نے کہا ''افسوس کیوں کرتے ہو، بیشک وہ شخص تمہارا روپیہ تو
لے کر بھاگ گیا، مگر نسخہ تو سِکھا گیا'' میرے عزیز نے سخت غصہ سے کہا کہ
''نہ وہ سکھا گیا نہ اُس خبیث کو خود آتا تھا'' میں نے کہا ''اُسے آتا تھا اور وہ
یہی تو تھا کہ وہ تم سے بغیر محنت کے پورے دو سو (200) روپے وصول کر
کے چل دیا۔ اُس سے زیادہ اور کیمیا کسے کہتے ہیں؟ اور تمہیں بھی یہی سکھا
گیا کہ جب بھی روپے کی ضرورت ہُوا کرے یہی نسخہ استعمال کیا کرو، بس
یہی کیمیا ہے'' اُس نے جَل بھُن کر کہا کہ ''کیمیا برحق ہے مگر یہ شخص ٹھگ
تھا۔ کیا آپ نے نہیں سُنا۔

کیمیا و سیمیا و رِیمیا
کس نداند جُز بذاتِ اولیا

میں نے کہا ''وہ یہی کیمیا اور سیمیا ہے جو شاہ صاحب آپ کو تعلیم
دے گئے ہیں۔ وہ اولیاء بھی ایسے ہی ہوتے ہیں جیسے شاہ صاحب تھے جو آپ
کے گھر میں ٹھہر کر اور آپ کو مونڈ کر چلے گئے۔ پس بسم اللہ پڑھ کر اس پر عمل
شروع کر دیجئے۔ اس سے بڑھ کر اور کوئی کیمیا نہیں'' وہ صاحب کہنے لگے ''کیا
پھر یہ سب جھوٹ ہی جھوٹ ہے؟'' میں نے کہا ''اور کیا۔ بھلا ایمان سے کہو تم
نے کبھی بھی سنا ہے کہ کسی شخص نے واقعی سونا بنا لیا ہو پھر وہ اِس وجہ سے بڑا
بھاری امیر اور متمول بن گیا ہو۔ بات یہ ہے کہ دُنیا میں جُنوں کی طرح طرح
کی قسمیں ہیں۔ ایک اُن میں سے یہ بھی ہے کہ جانتے بوجھتے ساری دولت
برباد کر دیتے ہیں اور پھر بھی جو پیسے کماتے ہیں وہ اِسی میں پھونکتے رہتے
ہیں۔ تُف ہے ایسی عقل پر اور لعنت ہے ایسے منحوس پیشہ پر۔ اے بیوقوف! اگر

تُو نے قلبِ ماہیت ہی کرنی تھی تو بجائے تانبے کے اپنے نفس کی قلبِ ماہیت کی ہوتی اور اُسے کُندن بنایا ہوتا، ورنہ سوچ لے کہ یہ کام تجھے کہاں سے کہاں لے جائے گا۔ اب تو صرف دو سو (200) روپیہ ہی گیا ہے کہیں ایسا نہ ہو کہ آئندہ رہنے کا ٹھیکرا بھی جائے مگر سونا پھر بھی نہ بنے۔

## (104) قابلِ رحم دُولہا

قصبہ فاضلکا کا ذِکر ہے کہ میں ایک دِن شفاخانہ میں بیٹھا تھا کہ ایک پولیس کا سپاہی ایک نوجوان شخص کو ہتھکڑی ڈالے اُس کی ضربات کا ملاحظہ کرانے کے لئے میرے پاس لایا۔ رپورٹ صرف اِس قدر تھی کہ اِس شخص نے ریلوے اسٹیشن فاضلکا پر ابھی ابھی سگنل کے پاس چلتی ہوئی ٹرین میں سے چھلانگ ماری ہے۔ پلیٹ فارم کے سپاہیوں نے یہ دیکھ کر جھٹ اُسے جا پکڑا۔ قریب ہی تھانہ تھا وہاں لے گئے اور پرچہ چاک کرا کر ہتھکڑی پہنا کر شفاخانہ میں لے آئے تاکہ اُس کی چوٹیں لکھی جائیں۔ جُرم صرف یہ تھا کہ اُس نے چلتی گاڑی میں سے چھلانگ لگائی ہے۔ مَیں نے نوجواں کی طرف نظر کی تو وہ کوئی بیس بائیس سال کا آدمی تھا۔ رنگین گوٹے دار پگڑی سر پر تھی اور کُرتہ پاجامہ بھی نیا اور بھڑکدار تھا۔ پوچھا کہ ''اصل بات کیا ہے؟'' وہ بیچارہ رو پڑا اور کہنے لگا کہ ''میں ایک برات کا دولہا ہوں، ہمارا گھر یہاں سے تین چار اسٹیشن پرے واقع ہے اور میں اپنی برات لے کر دُلہن کو بیاہنے ریل کے ذریعہ سفر کر رہا تھا کہ پچھلے اسٹیشن پر مجھے پیاس لگی۔ اُتر کر پانی جو پینے لگا تو گاڑی چل دی میں بھاگ کر ایک خانہ میں چڑھ گیا، مگر چڑھنے کے بعد معلوم ہُوا کہ زنانہ درجہ ہے۔ فوراً عورتوں نے چیخنا چلانا شروع کر دیا کہ یہ کون مرد ہے ہمارے خانہ میں آ گھسا ہے۔ بعض نے یہ بھی کہا کہ اگلا اسٹیشن آ لینے دو تجھے پولیس کے



حوالے کریں گے۔ میں دبک کر دروازہ کے پاس بیٹھ گیا اور خیال کیا کہ فاضلکا کے اسٹیشن پر پلیٹ فارم سے ذرا ورے ہی باہر کود پڑوں گا ورنہ اگر پولیس نے پکڑ لیا تو میری بڑی ذلّت ہو گی۔ محض اِس ذلّت اور گرفتاری سے بچنے کے لئے میں نے چھلانگ لگائی تھی۔ نتیجہ یہ ہُوا کہ چلتی گاڑی میں سے کودنے کی وجہ سے میرے سارے ریشمی اور قیمتی کپڑے پھٹ گئے، پگڑی کا ستیاناس ہو گیا اور سارا بدن رگڑوں اور چوٹوں سے زخمی اور چور چور ہو گیا۔

میں نے اُس کی ضربات تو پولیس کے کاغذ پر لکھ کر کانسٹیبل کے حوالے کیں اور کوشش کی کہ کم ازکم بیچارہ کی ہتھکڑی تو اُتر جائے مگروہ ریلوے ایکٹ کے ماتحت ایک سنگین دفعہ کا مُجرم تھا اور بغیر مجسٹریٹ کے روبرو پیش ہوئے اُس کی ضمانت تک نہ ہو سکتی تھی چہ جائیکہ رہائی پا جاتا۔

اب دوسری طرف کا حال سُنیئے۔ جب فاضلکا کا اسٹیشن آیا تو ساری برات وہاں اُتری کیونکہ وہیں سے برات کو اُس گاؤں میں جانا تھا جہاں دُلہن والے رہتے تھے۔ مگر کیا دیکھتے ہیں کہ دُولہا غائب ہے۔ بہتیرا ڈھونڈا مگر اُس کا پتہ نہ لگا۔ وہ بیچارہ تو تھانہ میں اور اُس کے بعد شفاخانہ میں مجرموں کی طرح ہتھکڑی پہنے کھڑا تھا۔ اُن لوگوں کو بڑی پریشانی ہوئی۔ اسٹیشن کے پاس ہی تھانہ تھا وہاں رپورٹ کی۔ کسی نے کہا کہ ''ہاں اس شکل کا ایک لڑکا چلتی ریل میں سے کودنے کے جرم میں گرفتار ہو کر ابھی یہاں آیا تھا اور اب شفاخانہ میں ہو گا وہاں جا کر دیکھو کہیں وہی تو تمہارا دولہا نہیں ہے؟

وہ بیچارے بھاگے بھاگے ہسپتال آئے تو عجب نظارہ دیکھا کہ جو گھر سے صبح کے وقت دُولہا بن کر اور سج دَھج کے کپڑے پہن کر نکلا تھا اب دوپہر کے وقت ہتھکری پہنے مجرم بنا کھڑا ہے اور ہیئت کذائی اس کی یہ ہے کہ سارا بدن چھِل گیا ہے۔ ناک اور پیشانی سے لہو بہہ رہا ہے۔ سر سے ننگا ہے۔ پاجامہ

اور قمیص پارہ پارہ ہے۔ بیچارے براتی یہ نظارہ دیکھ کر رونے لگے اور پولیس
والے کے آگے ہاتھ جوڑنے لگے کہ "یہ ناتجربہ کار ہے اِسے چھوڑ دو" مگر اُس
نے یہی کہا اور سچ کہا کہ "میرا کیا اختیار، تم تھانہ میں چل کر داروغہ جی سے کہو،
جُرم سنگین ہے شاید وہ مجسٹریٹ سے کہہ کر ضمانت کرا دیں۔"

غرض وہ لوگ شفاخانہ سے تھانہ اور تھانہ سے کچہری گئے جہاں بالآخر
وہ بیچارہ ضمانت پر رہا ہو گیا مگر جب تک مقدمہ کی پیشیاں ہوتی رہیں اُن لوگوں
پر سخت مصیبت کے دِن رہے۔ نہ وہ دُلہن والوں کے ہاں جا سکے، نہ بیاہ ہی
ہو سکا بلکہ ساری باتیں شادی کی ملتوی رہ گئیں۔ اُس سے آگے مجھے معلوم نہیں
کہ اُسے سزا ملی یا حکام نے رحم کر کے چھوڑ دیا اور دُلہن والوں نے ایک مجرم کو
لڑکی دینی منظور کی یا رشتہ توڑ دیا۔ بہرحال یہ ایک تقدیری آفت تھی کہ کیا سوچ
کر وہ لوگ گھر سے نکلے تھے اور کیا ہو گیا۔ انسان اپنی طرف سے ایک اندازہ
کرتا ہے مگر تقدیر اُس کے مخالف ہوتی ہے۔ حضرت علیؑ کا یہ کہنا بالکل سچ ہے۔
عَرَفْتُ رَبِّیْ بِفَسْخِ الْعَزَائِمِ یعنی میں نے خدا کی ہستی کو اِس بات سے
پہچانا کہ بندہ کچھ کرنا چاہتا ہے اور ساری عقل اور سارے انتظام کے ساتھ ایک
بات کو کرنے لگتا ہے اور بظاہر کوئی روک بھی اُس امر کے پورا ہونے میں نظر نہیں
آتی لیکن یکدم سب کئے کرائے پر پانی پھر جاتا ہے اور خدائی تقدیر غالب آ جاتی
ہے جیسا کہ اِس واقعہ سے ظاہر ہے۔

## (105) افیونی

پندرہ سولہ سال کا ذکر ہے کہ میں ایک دفعہ دہلی سے لاہور فرنٹیئر میل
میں آ رہا تھا، اُس وقت فرنٹیئر میل بٹھنڈہ لائن پر چلا کرتی تھی۔ میرے ساتھ
گاڑی میں ایک نہایت معزز آدمی ہمسفر تھے، مگر میں اُن کو جانتا نہ تھا۔ چند گھنٹے



تو وہ خاصے تندرست، بھلے چنگے بیٹھے باتیں کرتے رہے مگر شام کے قریب
یکدم اُن کے ملازم نے ایک بڑا سا اُگالدان اُن کے سامنے لا کر رکھ دیا اور
اُنہوں نے کھانسنا شروع کیا۔ کھانسی اور قے میں اِس قدر بلغم نِکلا کہ وہ
اُگالدان دس منٹ میں بھر گیا۔ مَیں حیران تھا کہ یہ کیا معاملہ ہے۔ اتنے میں
اگلے اسٹیشن پر اُن کا منشی دوسرے ڈبہ میں سے آ کر ہماری گاڑی کے باتھ روم
(غسل خانہ) میں گُھس گیا اور یہ کہتا گیا کہ "پیر صاحب ابھی لاتا ہوں" پھر
غسل خانہ کا دروازہ اس نے بند کر لیا اور اندر کسی کام میں مصروف ہو گیا۔
تھوڑی دیر میں دروازہ کُھلا تو منشی کے ہاتھ میں مَیں نے ایک زیر جلد ٹیکہ
لگانے والی پچکاری (یعنی ہائی پوڈمک سرنج) دوا سے بھری ہوئی دیکھی۔ وہ
پچکاری ٹیکہ کی اُس نے پیر صاحب کے بازو میں انجکشن کر دی۔ اُس وقت مجھے
معلوم ہُوا کہ منشی صاحب غسل خانہ میں ٹیکہ تیار کر رہے تھے۔ ٹیکے کے پانچ
منٹ بعد پیر صاحب کی کھانسی، بلغم اور قے سب بند ہو گئے اور وہ پھر پہلے کی
طرح چہکنے لگے۔ میں سمجھ گیا کہ پیر صاحب کو مارفیا کی عادت ہے۔ جب اُس
کا وقت آیا اور نشہ ٹوٹنے لگا تو کھانسی اور قے شروع ہو گئی۔ اب اُن کو ٹیکہ لگ
گیا ہے، رات آرام سے کٹ جائے گی۔

خیر جب اُن کی طبیعت ذرا بشاش ہوئی تو میں نے کہا "پیر صاحب!
میں بھی ڈاکٹر ہوں، آپ نے کس تکلیف کے لئے مارفیا کا ٹیکہ لگوایا ہے؟"
فرمانے لگے "ڈاکٹر صاحب! میں فلاں گدی کا پیر ہوں جو سارے پنجاب میں
معزز اور عالیشان سمجھی جاتی ہے۔ اتفاقاً ایک دفعہ مجھے گُردہ کا درد اُٹھا۔ اور سخت
اُٹھا۔ مقامی ڈاکٹر کو بُلایا۔ اُس نے کئی علاج کئے مگر فائدہ نہ ہُوا بلکہ درد بڑھتا
ہی گیا۔ آخر مجبور ہو کر اُس نے مارفیا کی ایک ٹِکیہ کا ٹیکہ مجھے کر دیا۔ مجھے جادُو
کی طرح اس ٹیکہ سے درد کو آرام آ گیا۔ مگر دوسرے دِن نشہ اُترنے پر پھر درد

موجود، غرض یہ کہ دو تین دِن متواتر یہی عمل ہوتا رہا۔ پھر آرام آ گیا۔ کچھ دِن بعد پھر گردہ کا درد ہُوا اور اسی طرح ہر دس پندرہ روز کے بعد ہوتا رہا اور ساتھ ہی مارفیا سے آرام بھی آتا رہا۔ چند ماہ کے ایسے علاج کے بعد مجھے اس دوا کی عادت پڑ گئی، اور بجائے ایک ٹکیہ مارفیا کے دو ٹکیوں کا بیک وقت انجکشن کرانا پڑتا تھا۔ اِس بات کو کئی سال ہو گئے مگر اب یہ حال ہے کہ ساری ٹیوب جس میں مارفیا کی بیس ٹکیاں ہوتی ہیں صبح کو اور ایک پوری ٹیوب بیس ٹکیوں کی اِس وقت شام کو انجکشن کراتا ہوں تو زندہ رہ سکتا ہوں ورنہ کھانسی اور بلغم سے ہر پانچ پانچ منٹ بعد یہ اُگالدان بھر جاتا ہے'' میں نے کہا 'مارفیا تو افیم کا ست ہے اِس کا ملنا مشکل ہے۔ خصوصاً آپ کے لئے جو ڈاکٹر نہیں ہیں اور پھر اِس کثرت سے کہ ایک سال میں 700 نلکیوں کا خرچ ہے!'' فرمانے لگے ''اِس کی ہمیں فکر نہیں، فلاں دوا فروش ہمارا ٹھیکہ دار ہے۔ خدا اُسے سلامت رکھے وہی مہیا کرتا ہے اور گو ایک روپیہ کے پانچ روپے لیتا ہے مگر دوا میں کمی نہیں آنے دیتا اور ہماری زندگی بھی چونکہ اِس دوا سے وابستہ ہے اور خدا نے ہمیں بہت کچھ دے رکھا ہے اِس لئے ہم کو بھی پرواہ نہیں ہے'' وہ پیر صاحب بڈّھے آدمی نہ تھے، یہی کوئی چالیس بیالیس سال کے ہوں گے۔ مجھے اُن کی بے کسی اور نشہ کی غلامی پر ترس آیا۔ ایک منشی صرف اِسی بات پر اُنہوں نے نوکر رکھا ہُوا تھا کہ صبح شام پچکاری اور سُوئی اُبال کر ڈاکٹروں کی طرح پوری احتیاط سے ٹیکہ لگائے اور دوا کی مقدار میں کمی نہ آنے دے۔ خیر اُن کا ہمارا ساتھ لاہور تک رہا، وہاں سے وہ اپنے گھر چلے گئے۔

چند سال کے بعد میں نے اس شہر کے بعض لوگوں سے دریافت کیا تو معلوم ہُوا کہ اُن کا انتقال ہو چکا ہے۔ نشہ کی مقدار بڑھتی گئی اور اُن کے گُردے، جگر اور دِل خراب ہوتے گئے، آخر وہ بیچارے فوت ہو گئے۔



کم بخت مارفیا یا افیم کا نشہ سب نشوں سے زیادہ ظالم ہے۔ ایک تو روزانہ استعمال کے سوا چارہ نہیں، دوسرے یہ کہ مقدار مسلسل بڑھانی پڑتی ہے۔ تیسرے یہ کہ خصوصاً دماغ کو تو فسانۂ آزاد کے خوجی کی طرح خراب کر دیتی ہے۔ اِس کا نظارہ میں نے جیل خانوں میں دیکھا ہے۔ میرے خیال میں ہندوستان میں اِس نشہ کا اب بھی بے حد رواج ہے اور جب جیل میں داخل ہو کر عادی لوگوں کو نہیں مِلتا تو اُن کی حالت دیکھنے کے قابل ہوتی ہے۔ بیچارے زمین پر مچھلی کی طرح تڑپتے اور لوٹتے پھرتے ہیں۔ آنکھ، ناک اور مُنہ سے پانی جاری ہو جاتا ہے۔ پنڈلیوں سے پنڈلیاں اس طرح رگڑتے ہیں جس طرح جان کندنی کے وقت مرنے والوں کی حالت ہوتی ہے۔

ایک جوان شخص قریباً پچیس (25) سال کی عمر کا میرے پاس آیا اور کہنے لگا کہ ''میں چھ سات سال سے افیون کا عادی ہوں اور کمپٹیشن (مقابلہ) کرتے کرتے اب چھ ماشہ افیون روزانہ کھایا کرتا ہوں'' میں نے پوچھا ''کس لئے شروع کی تھی؟'' کہنے لگا ''عیاشی کے لئے کیونکہ اِس سے بڑھ کر ممسک اور کوئی چیز نہیں۔ اب پچیس سال کی عمر ہے۔ اِس نشہ نے قوتِ باہ تو قطعاً فنا کر دی مگر عادت نشہ کی برابر بڑھتی چلی گئی'' میں نے کہا ''ایسی عیاشی کی کیا ضرورت تھی؟'' کہنے لگا ''بازاری عیاشی کے سرکل میں نوجوانی کی عمر میں ہی داخل ہو گیا تھا، وہاں رقیبوں سے مقابلہ درپیش رہا تھا، اِس لئے کھانی شروع کی تھی۔ اب یا تو چند ماہ تک اِسے چھڑا دیجئے ورنہ چلتی ٹرین کے نیچے ہمارا ٹھکانہ ہے۔''

## (106) پیسہ

پانی پت میں میری میل ملاقات مولانا حاؔلی کے خاندان کے لوگوں

سے ہوگئی۔ ایک دِن اِس خاندان کے ایک گریجویٹ خواجہ غلام السبطین میرے پاس تشریف لائے اور یہ تازہ بتازہ قصہ مجھے سُنایا کہ ”میری ایک بھتیجی ہے کوئی پندرہ سال کی سیّدہ اُس کا نام ہے۔ چند دِن ہوئے اُس کے دِل میں خیال پیدا ہُوا کہ ہمارے محلّہ کی لڑکیاں بالکل جاہل اور ان پڑھ ہیں مناسب ہے کہ مَیں اُن کے لئے ایک اسکول اپنے گھر میں ہی کھول دوں۔ چنانچہ اُس نے اسکول کھول کر سارے محلّہ کی عورتوں کو کہلا بھیجا کہ ”جسے اپنی لڑکی پڑھوانی ہو وہ ہمارے ہاں اُسے بھیج دیا کرے“ اس طرح پندرہ بیس لڑکیاں میری بھتیجی کے پاس آ کر پڑھنے لگیں۔ آج اُسے خیال آیا کہ مناسب ہو گا کہ سب لڑکیوں کے نام معہ اُن کی ولدیت وعمر وغیرہ ایک رجسٹر میں درج کر لوں۔ چنانچہ ایسا کیا گیا۔ لکھتے لکھتے ایک لڑکی سے جب اُس نے پوچھا کہ ”تمہارا نام کیا ہے؟ تو وہ کہنے لگی ”اختر“ پھر پوچھا کہ تمہارے باپ کا نام کیا ہے؟“ کہنے لگی ”پیسہ“ اِس پر میری بھتیجی بہت حیران ہوئی اور بار بار پوچھا مگر یہی جواب پایا کہ میرے باپ کا نام پیسہ ہے، پھر تو میری بھتیجی بہت متعجب ہوئی اور مجھ سے کہنے لگی ”چچا! یہ لڑکی کہتی ہے کہ میرے باپ کا نام پیسہ ہے“ اِس پر میں نے اُس لڑکی سے پوچھا تو مجھے بھی اُس نے یہی جواب دیا۔ آخر میں مَیں نے لڑکی سے اُس کے مکان کا پتہ پوچھا تو معلوم ہُوا کہ یہ تو مُنّی طوائف کی لڑکی ہے۔ اس وقت خیال آیا کہ غالبًا ایسی عورتیں اپنی اولاد کو یہ بتاتی ہوں گی کہ ”جب کوئی تمہارے باپ کا نام پوچھے تو تم کہہ دینا کہ ہمارے باپ کا نام پیسہ ہے“ غرض میں نے اپنی بھتیجی سے کہہ دیا کہ ”تم اِس لڑکی کی ماں کا نام بجائے اس کے باپ کے نام کے لکھ لو اور میں آپ کو یہ لطیفہ سُنانے کے لئے شفاخانہ کی طرف چلا آیا۔“

یہ قصہ سُن کر میں نے بھی اُن کو ایک ذکر سُنایا کہ ایک بڑا شریف



صورت کنجر تھا۔ جب اُس سے کوئی ناواقف پوچھتا کہ ”آپ کے والد کا نام کیا ہے؟“ تو وہ اپنی جیب میں سے ایک روپیہ نکال کر دکھا دیا کرتا تھا، یعنی میرا باپ روپیہ ہے۔

## (107) دعویٰ اور چیز ہے اور حقیقت اور چیز

ایک میرے رشتہ دار بزرگ تھے وہ ظاہر حصۂ مذہب کے بہت پابند تھے۔ جب بھی اُن سے کبھی ذکر آتا کہ دُنیا کی اخلاقی اور رُوحانی حالت بہت خراب ہوگئی ہے اور وہ ایک حقیقی مصلح کی محتاج ہے تو فرمایا کرتے کہ ہاں اور لوگ شاید محتاج ہوں مگر ہم تو نہیں ہیں، ہم تو پچاس سال سے باقاعدہ نماز پڑھتے ہیں۔ رمضان کے روزے رکھتے ہیں بلکہ نفلی بھی، تہجد پڑھتے ہیں۔ پچھلی رات سے ذِکر شروع کرتے ہیں تو محلّہ والے بھی بیدار ہو جاتے ہیں۔ حزب البحر کئی لاکھ دفعہ پڑھ چکے ہیں۔ دُعائے گنج العرش کا لفظ لفظ حِفظ ہے، کسی سے بُرائی نہیں کرتے۔ کوئی عیب ہم میں نہیں، لوگوں کی خیرخواہی اور خدمت میں لگے رہتے ہیں۔ بھلا ہمیں کسی مُصلح کی کیا ضرورت ہے۔“

چونکہ صوبۂ بہار کی طرف ہمارے کنبہ کو بعض گاؤں بطور معافی ملے ہوئے تھے اِس لئے ان بزرگ کو ہم نے اپنا مختار بھی بنا رکھا تھا۔ ایک سال ہماری غفلت اور گاؤں والوں کی شکایت کی وجہ سے وہ گاؤں نیلامی پر چڑھ گئے۔ بیچارے بُزرگ دَوڑے اور بڑی کوشش سے دیہات کو واگزار کرایا۔ مقدمات ہوئے۔ گواہیاں پیش ہوئیں تو اُن کو بہت سے گواہ فرضی کھڑے کرنے پڑے۔ کئی آدمیوں سے غلط اور جھوٹی گواہیاں دلوانی پڑیں، اور بہت سی ناجائز باتیں کرنی پڑیں۔ جب فتحیاب ہو کر واپس آئے تو فخریہ بیان کرنے لگے کہ ”میں نے زمینیں واگزار کرانے کے لئے اِن اِن فریبوں اور

چالاکیوں، رشوتوں اور جھوٹی گواہیوں سے کام لیا تب مطلب بر آیا''۔

میں نے عرض کیا ''حضرت یہ تو سب کچھ دُرست مگر کیا یہ باتیں شرعاً جائز تھیں؟ فرمانے لگے ''اور کیا کرتا؟''

اِس وقت اُن کے ظاہری تقویٰ کی سب حقیقت ہم پر اور خود اُن پر واضح ہو گئی کہ ذرا سا نقصان دیکھ کر یہ بظاہر پارسا لوگ ہر قسم کی ناجائز کارروائی پر آمادہ ہو جاتے ہیں۔ تب پتہ لگتا ہے کہ ان میں صرف ظاہری دینداری ہے یا حقیقی پاکیزگی۔ یہ ٹھیک ہے کہ اکثر مولویوں اور صوفیوں کا ظاہری حال پسندیدہ نظر آتا ہے مگر مشکلات، مصائب اور مقدمات کے وقت ساری حقیقت کُھل جاتی ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ دُنیا اِس زمانہ میں واقعی بڑی اصلاح کی محتاج ہے۔ بڑی بڑی سلطنتیں صرف امن انصاف اور دُنیا میں اصلاح اور ترقی کی خاطر لڑنے کی دعویدار ہیں مگر پردہ اُٹھا کر دیکھو تو وہی زمین کی حرص، قومی برتری، خام مصالحہ کے حصول کی خواہش پر ایک دوسرے سے نفرت، ان سب دعوؤں کی پشت پر کارفرما نظر آئیں گی اور اپنے مطلب کے حصول کے لئے جھوٹ، رشوت، ظلم اور چالاکی سب شیرِ مادر ہوں گے۔

دُنیا کی حِرص و آز میں کیا کچھ نہ کرتے ہیں
نقصاں جو ایک پیسے کا دیکھیں تو مرتے ہیں

## (108) بیویوں میں عجیب اور نرالا انصاف

ایک میرے دوست تھے۔ اب فوت ہو چکے ہیں۔ حکیم بلکہ اشتہاری حکیم تھے۔ اُن کی چار بیویاں تھیں۔ بیچارے کہیں سے یہ بھی سُن بیٹھے تھے کہ شریعت کا حکم ہے کہ جب تم ایک سے زیادہ بیویاں کرو تو عدل و انصاف پر عمل کرو۔



ایک دِن اُن کی ایک بیوی ہمارے ہاں آئیں تو اُن کے جسم پر تازہ نشانات زد و کوب کے تھے۔ کسی نے پوچھا کہ ''کیا حکیم صاحب آپ سے ناراض ہیں؟'' کہنے لگیں'' نہیں تو وہ تو بیوی نمبر 2 سے ناراض تھے'' پوچھنے والے نے کہا ''پھر یہ چوٹوں کے نشان آپ کے جسم پر کیسے ہیں؟'' کہنے لگیں کہ ''یہ عدل و انصاف کے نشانات ہیں'' اُس نے نہایت تعجب سے پوچھا ''ہیں وہ کیسے؟ اِس پر اُنہوں نے کہا کہ ''حکیم جی جب بھی اپنی کسی بیوی پر ناراض ہوتے ہیں تو اُسے خوب پیٹتے ہیں مگر پیٹنے کے بعد اپنی باقی تین بیویوں کو سامنے بُلا کر فرماتے ہیں کہ اب میں جب گھر سے باہر جاؤں گا تو تم تینوں اس کی نقلیں کرو گی اور اِسے چڑاؤ گی نیز انصاف کا تقاضہ بھی یہی ہے کہ جب اِسے مار پڑی ہے تو تمہیں بھی پڑے۔ اس لئے اب ادھر میرے پاس آ جاؤ۔ اِس کے بعد جس قدر مار پہلی کو پڑی تھی اُتنی ہی مار کوٹ سے باقیوں کی تواضع فرماتے ہیں۔ یہ میرے جسم پر اس عدل و انصاف کے نشانات ہیں۔ ناراضگی کے نہیں ہیں۔''

## (109) قتل کے بعض عجیب وجوہات

جہلم، کیملپور، رہتک اور فیروزپور وغیرہ کے اضلاع پنجاب میں قتل کے لئے مشہور ہیں۔ ذرا ذرا سی بات پر لوگ ایک دوسرے کو مار دیتے ہیں۔ ایک دفعہ میں نے ایک پولیس کپتان سے کہا کہ آپ کے ضلع میں قتل بہت ہوتے ہیں آپ انسداد کریں'' فرمانے لگے کہ ''کیا لوگوں کی جنگی روح کو بالکل ہی کُچل دیا جائے۔ جس قدر لوگ ایک دوسرے کو قتل کرنے میں بیباک ہوں اُتنی ہی اُن میں فوجی اسپرٹ ہوتی ہے۔ اِسی واسطے میرے ضلع کے لوگ بکثرت فوج میں بھرتی ہوتے ہیں۔ اگر اِن پر سختی کی جائے تو یہ بُزدل ہو

جائیں پھر ہم فوج کے لئے بھرتی کہاں سے لائیں؟'' میں نے کہا ''یہ خوب عذر ہے!!'' فرمانے لگے ''جب تک لوگ آپس میں ایک دوسرے کو قتل کرتے رہیں ہم زیادہ پرواہ نہیں کرتے لیکن جب سرکار انگریزی کے برخلاف کسی کے منہ سے ایک لفظ بھی نکلے تو اُس وقت ہم لوگوں کے فرض کی ادائیگی کا وقت ہوتا ہے۔ ایک دوسرے کو قتل کرنا سلطنت کی مضبوطی میں رخنہ نہیں ڈالتا بلکہ پنجاب کی شجاعت کے قیام کا باعث ہے ہاں کوئی کانگریسی لالہ سرکار کے برخلاف ایک اُنگلی بھی اُٹھا دے اُس وقت ہماری ساری مشینری حرکت میں آ جاتی ہے۔''

خیر یہ تو تمہیدی جملہ تھا۔ اب اٹک کے ضلع کا ایک واقعہ سناتا ہوں۔ ایک شخص کی گائیں کئی روز دوسرے زمیندار کے کھیت میں دیکھی گئیں۔ ایک دِن جب وہ دونوں اپنے مویشیوں کو شارع عام پر چرا رہے تھے تو ایک نے دوسرے کو کہا کہ ''آئندہ تیرا مویشی ہمارے کھیت کی طرف نہ آئے ورنہ اچھا نہ ہوگا'' دوسرے نہ کہا ''تُو کیا کر لے گا؟ ذرا میرے جانور کو ہاتھ لگا کر دیکھ!'' پہلے نے وہیں سڑک پر اپنی لاٹھی سے جس کے سرے پر نیزے کی طرح کا پھل لگا ہُوا تھا ایک گول نشان بنا دیا یعنی دائرہ کی طرح ایک لکیر کھینچ دی اور کہا ''اچھا یہ میرے کھیت کا نشان ہے تو ذرا اس میں اپنا مویشی داخل تو کر'' دوسرے نے جھٹ اپنا ایک پیر بڑھا کر اپنی جوتی اُس دائرہ کے اندر رکھ دی اور کہا ''لے میرا مویشی تیرے کھیت میں داخل ہو گیا'' یہ سُنتے ہی پہلے نے اپنا نیزہ اُٹھا کر فوراً اِس زور سے اپنے مخالف کی چھاتی میں مارا کہ سینہ توڑ کر پار ہو گیا اور وہ شخص وہیں ڈھیر ہو کر رہ گیا۔

اب ایک دوسرا قصہ جہلم کے ضلع کا سُنیئے وہاں ایک گاؤں میں ایک نوجوان شخص جب کچھ لکھ پڑھ کر فارغ ہُوا تو اُس نے گاہے بگاہے ضلع کے



صدر مقام جہلم میں جانا شروع کیا۔ چند مرتبہ گاؤں سے اُس کی غیر حاضری لوگوں کے نوٹس میں آئی۔ تفتیش ہوئی تو پتہ لگا کہ یہ شہر جہلم کو جایا کرتا ہے۔ پھر مزید رپورٹیں ہوئیں کہ وہاں کچہری کے احاطہ میں دیکھا گیا ہے۔ اِس پر لوگ کہنے لگے کہ شاید حکام سے ملنے جاتا ہے اور ہمارے برخلاف ضرور کہتا سنتا ہوگا۔ بعدازاں معلوم ہوا کہ ایک دِن وہ کسی بڑے افسر سے اُس کی کوٹھی پر ملا ہے۔ بس پھر کیا تھا چند لوگوں نے اُس کے قتل کا فتویٰ صادر کر دیا۔ دوسرے دِن گاؤں کا ایک آدمی اُسے بہلا پھُسلا کر گاؤں سے باہر لے گیا وہاں کھیتوں میں چند آدمی موجود تھے۔ اُنہوں نے اُس کا کام تمام کر دیا۔ نہ کوئی دُشمنی نہ عداوت نہ انتقام۔ صرف یہ قصور تھا کہ یہ حکام رس ہوتا جاتا ہے کہیں ہم گاؤں والوں کو کوئی نقصان نہ پہنچائے۔

## (110) مسمریزم

اکثر مقامات پر کلبوں اور جلسوں میں مَیں نے مسمریزم کرنے والوں کے تماشے دیکھے ہیں۔ کئی تماشے تو صرف چابکدستی اور ہوشیاری کے کھیل ہوتے ہیں لیکن کئی جگہ اصل مسمریزم بھی ہوتا ہے اور مسمرائزر اپنے ساتھ ایک لڑکا بطور ''معمول'' رکھتا ہے، جس پر توجہ ڈال کر وہ باتیں پوچھتا ہے۔

ایک دفعہ ایک کلب میں سب افسر لوگ بیٹھے ہوئے ایسے ہی تماشے دیکھ رہے تھے کہ تماشے والے نے کہا ''صاحبان! آپ اپنے دِل میں کسی پھول کا خیال کریں۔ اس کے بعد اُس نے کہا کہ ڈپٹی صاحب آپ نے موتیا کا پھول دِل میں رکھا ہے۔ تحصیلدار صاحب آپ نے چنبیلی کا پھُول۔ کپتان صاحب آپ نے نرگس کا پھُول'' وغیرہ وغیرہ۔ سب لوگ یہ بات دیکھ کر متعجب ہوئے۔ وہاں صاحب ڈپٹی کمشنر بھی موجود تھے۔ اُنہوں نے کوئی پھول

اپنے دِل میں نہیں رکھا تھا۔ کہنے لگے کہ ''میں نے تو کوئی پھول دِل میں نہیں رکھا، مگر تم نے اِن لوگوں کو جواب بہت صحیح دیے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ تم نے کوئی اندازہ لگایا ہے'' تماشا والا کہنے لگا ''اب آپ اپنے دِل میں کسی پھول کا نام سوچ لیں'' ڈپٹی کمشنر صاحب نے کہا ''اچھا میں نے سوچ لیا، اب بتاؤ'' وہ شخص کچھ دیر تو چُپ رہا پھر کہنے لگا ''گوبھی کا پھول'' ڈپٹی کمشنر صاحب کُرسی سے اُچھل پڑے اور کہنے لگے ''میں نے خیال کیا تھا کہ ایسا پھول ذہن میں رکھوں جدھر تمہارا خیال بھی نہ جائے مگر تم نے بتا ہی دیا''۔

اسی طرح یہ لوگ نوٹوں کے نمبر، گھڑی کا وقت اور بعض باتیں جو کاغذ پر لکھ کر محفوظ کر لی جاویں اپنے ''معمول'' (یعنی سبجیکٹ) کی معرفت بتا دیتے ہیں حالانکہ اُس لڑکے کی آنکھوں پر پٹی بندھی ہوئی ہوتی ہے۔ ان سب تماشوں کو دیکھ کر جو نتیجہ مَیں نے نکالا ہے وہ یہ ہے کہ مسمرائزر اپنے عمل کے زور سے غیب حاضر بتا سکتا ہے، یعنی ایسی مخفی چیز جو موجود ہو اور قریب ہو لیکن غیب غائب یعنی ایسی بات غیب کی جو آئندہ ہونے والی ہو نہیں بتا سکتا۔ مثلاً وہ لڑکا یہ تو کہہ دے گا کہ فلاں شخص کی جیب میں اتنے روپے ہیں یا فلاں گھڑی میں یہ وقت ہے مگر فاصلہ بہت ہو تب نہیں بتا سکے گا اور نہ یہ بتا سکے گا کہ کل پرسوں یا فلاں دِن ایسی ایسی بات وقوع میں آئے گی۔ حاضرین میں سے کسی کے دِل کی خاص بات اُس وقت تو پڑھ لے گا لیکن یہ کہ دس دِن کے بعد فلاں شخص کو پچاس روپیہ کا منی آرڈر ملے گا یہ نہ بتا سکے گا۔ پس مسمرائزر کا غیب نزدیک کی پیش پا افتادہ اور موجود باتوں کے متعلق تو ٹھیک ہو سکتا ہے مگر وہ پیشگوئی نہیں کر سکتا۔ لوگ غلطی سے اِن دونوں باتوں کو مِلا دیتے ہیں اور اس کو غیب دان سمجھ لیتے ہیں۔

یوگ بھی مسمریزم ہی کی مشق ہے اور اس کی بھی یہی اصلیت ہے۔



یوگ میں کسی لڑکے کو مسمرائز کرنے کے بجائے خود اپنے آپ کو مسمرائز کرتے ہیں۔ یوگی بھی اپنی مشق کے زور سے یہ تو بتا دے گا کہ کسی بند خط میں کیا مضمون ہے (کیونکہ یہ غیب حاضر ہے) لیکن یہ نہ بتا سکے گا کہ اگلے برس مجھے اِس مضمون کا خط فلاں شخص کی طرف سے ملے گا۔ (کیونکہ یہ پیشگوئی ہے)۔

اس عِلم کا مذہب سے کوئی تعلق نہیں۔ ہر مذہب والا بلکہ لامذہب اور دہریہ بھی اس کی مشق کر سکتا ہے اور تماشے دِکھا سکتا ہے۔ غلطی سے آج کل اِسی طاقت کا نام لوگوں نے مذہب کی روحانیت رکھ چھوڑا ہے۔ بیماروں کا اچھا کرنا، توجہ دینا، دِلوں پر اثر ڈالنا، بیہوش کر دینا وغیرہ یہ سب مسمریزم ہے اور ہر مذہب والا کر سکتا ہے بشرطیکہ اُس میں قدرتی طور پر یہ طاقت زیادہ ہو اور مشق اچھی ہو۔ مشہور غلام پہلوان امرتسری کا لڑکا ایک دفعہ میرے پاس آیا تو میں نے پوچھا کہ ''باپ کا علم بھی کچھ سیکھا ہے؟'' کہنے لگا ''نہیں'' میں نے کہا ''کیوں؟'' اُس نے جواب دیا کہ ''بات یہ ہے کہ جب اکھاڑے میں اُترتا ہوں تو دَم چڑھ جاتا ہے اور مَیں قدرتی طور پر سخت ورزشوں کے ناقابل ہوں'' اِسی طرح بعض آدمی قدرتی طور پر توجہ یعنی مسمریزم کی طاقت اپنے اندر زیادہ رکھتے ہیں ایسے لوگ اگر مشق کریں تو بیہوش کرنا تو کیا ایک نظر سے انسان کو مار بھی سکتے ہیں، مگر اس کا تعلق مذہب سے کیا؟ آدمی تو لٹھ سے بھی مارا جا سکتا ہے۔ پس جو لٹھ اچھا چلائے وہ بھی خدا رسیدہ ہوتا ہو گا؟ مذہب صرف دو چیزوں کا مجموعہ ہے (1) خدا شناسی (2) اعلیٰ اخلاق، نہ کہ مسمریزم اور پہلوانی کیونکہ مسمریزم بھی اعصاب کی پہلوانی ہی ہے۔

## (111) کوڑی کا چکّر

ایک شخص ہمارے ہاں آیا اور سب لوگوں سے کہنے لگا کہ ''مجھے ایک

عمل آتا ہے جس سے یہ پتہ لگ جاتا ہے کہ ہمارا فلاں مقصد پورا ہو جائے گا یا نہیں؟ میں نے کہا ''اچھا دِکھاؤ'' اُس نے ایک کوڑی نکالی اُس کے اندر کوئی ایک انچ لمبا تنکا دے کر اُس تنکے کو زمین میں گاڑ دیا۔ اس طرح کہ کوڑی کو لے کر وہ تنکا زمین پر کھڑا تھا۔ پھر کہنے لگا کہ ذرا سا پانی لاؤ۔ اور اپنے دِل میں کوئی بات سوچ لو۔ ہم نے سوچ لی کہ فلاں کام ہو گا یا نہیں۔ اِس پر اُس نے کچھ منتر وغیرہ پڑھ کر کہا کہ ''اب مَیں اِس کوڑی پر پانی چھڑکتا ہوں اگر یہ دائیں طرف پھر گئی تو مطلب پورا ہو جائے گا، اگر بائیں طرف اِس نے چکّر کھایا تو نہیں پورا ہو گا'' پانی کا چھڑکنا تھا کہ آہستہ آہستہ وہ کوڑی دائیں طرف کو چکّر کھانے لگی۔ ہم سب حیران تھے۔ پھر اور لوگوں نے بھی اپنے مطلب پوچھے۔ ہر دفعہ وہ نیا تنکا لگاتا تھا اور زمین میں اُسے گاڑ کر پانی چھڑکتا تھا۔ کبھی وہ کوڑی دائیں طرف چکّر لگاتی تھی اور کبھی بائیں طرف۔ جب وہ جلسہ ختم ہُوا تو کھوج لگاتے لگاتے آخر ساری حِکمت کا پتہ لگ ہی گیا۔ وہ شعبدہ یہ تھا کہ خشک گھاس کے سخت سے تنکے یا جھاڑو کے مناسب تنکے کو وہ شخص اپنی چٹکی سے کئی بَل دے دیتا تھا، پھر اُس میں کوڑی پھنسا کر زمین میں گاڑ کر جب پانی چھڑکتا تھا تو تنکے کو پانی لگتے ہی اس کی نمی سے وہ بَل کُھلنا شروع ہو جاتا تھا اور کوڑی چکّر کھانے لگتی تھی اس طرح وہ لوگوں کو ٹھگا کرتا تھا۔ لڑکیاں لڑکے تک اِس کھیل کو خود آزما کر دیکھ سکتے ہیں مگر ناواقف آدمی ہو، تماشا والا مقدس صورت ہو اور منتر یا آیتیں پڑھ کر پانی چھڑکا جائے تو اکثر آدمی دھوکا کھا جاتے ہیں۔

## (112) آزاد لڑکیاں

ایک پادری صاحب تھے۔ اُن کی ایک بیوہ لڑکی تو میرے شفاخانہ میں



نرس تھی اور دوسری جو اٹھارہ بیس سال کی تھی کسی پہاڑ پر مِشن اسکول میں پڑھتی تھی۔ ایک دفعہ وہ طالب علم لڑکی پہاڑ سے بیمار پڑ کر اپنے والدین کے پاس آئی۔ چند روز میں اُس کی حالت اور خراب ہو گئی تو اُس کی بہن نرس نے مجھے کہا کہ ''مہربانی کر کے میری بہن کو دیکھ لیں، وہ بہت بیمار ہے'' میں نے کہا ''کیا ہے؟'' کہنے لگی ''ٹائیفائیڈ ہے مگر ڈیڑھ مہینہ سے بُخار نہیں اُترا بلکہ زیادہ ہی ہوتا جاتا ہے اور اب تو بہکنے بھی لگی ہے۔ حالت نازک ہے'' خیر میں اُن کے ہاں گیا۔ واقعی بہت پتلا حال تھا کروٹ دے کر پھیپھڑے دیکھے تو اُن میں کسی بیماری کا اثر نہ تھا۔ اس کے بعد میں نے اُس کے پیٹ پر سے فراک اونچا کر کے ٹٹولنا چاہا تو باوجود اُس کے کہ وہ نیم بیہوش تھی اُس نے مقابلہ کیا اور فراک کو اس طرح پکڑ لیا کہ پیٹ ننگا نہ ہو سکے۔ مَیں نے اُس کی بہن سے کہا کہ اس کا مضائقہ نہیں اور صحیح تشخیص کے لئے پیٹ کا معائنہ اور اُس کا آنکھوں سے دیکھنا ضروری ہے۔ میں نے دیکھا کہ میرے اِس کہنے پر نرس کا رنگ بھی فق ہو گیا۔ آخر میرے زور دینے پر اُس نے مریضہ کے ہاتھ پکڑ لئے اور کہا کوئی ڈر نہیں ڈاکٹر صاحب کو دیکھنے دو۔ میں نے نہایت سادگی سے فراک اونچا کیا۔ اُس وقت مجھے پتہ لگا کہ کیوں مریضہ اور اُس کی بہن اور ماں باپ اِس معائنہ سے کتراتے تھے۔ کپڑا اُٹھاتے ہی یہ نظر آیا کہ سارا پیٹ اُن لکیروں سے بھرا پڑا ہے جو حمل میں عورتوں کے شِکم پر پیدا ہو جاتی ہیں۔ حالانکہ بیچاری نا کتخدا تھی۔ یہ دیکھتے ہی میں نے جھٹ اُس کا فراک نیچے کر دیا اور سارا معاملہ سمجھ گیا۔ پہاڑ پر بیچاری کا وضع حمل ہُوا اور پورا بچہ تھا۔ وہ جُن کر پرسُوت یعنی زچگی کا بُخار ہو گیا جسے وہاں ٹائیفائیڈ کہتے رہے۔ آخر لڑکی گھر آ گئی یہاں بھی یہی مشہور رہا مگر بُخار زہریلا تھا دو چار روز میں بیچاری فوت ہو گئی۔

لڑکیوں کی صحیح نگرانی والدین کے سوا غیر جگہوں میں خصوصاً جب وہ بے پردہ پھرتی ہوں، ایک محال امر ہے۔ ایک لعنت تو سُرخی، سفیدہ، پوڈر، بال سنوارنے اور حُسن دکھانے کی تھی ہی دوسری لعنت آج کل فحش لٹریچر کی ہے۔ تیسری لعنت آزادی کی۔ چوتھی لعنت بعض حالات میں مردوں کے پہلو بہ پہلو بیٹھنا۔ مثلاً مردوں سے تنہا کمروں میں ٹیوشن لینا۔ موٹر ڈرائیوروں کی بغل میں یا اُن سے لگ کر اسکول یا کالج جانا۔ کالج کی بنچوں پر لڑکوں کے ساتھ دوش بدوش نشست، بارونق سڑکوں پر سیر وتفریح۔ اپنے گزارے کے لئے کلرکی کرنی۔ سینما اور ٹاکی کا زہر وغیرہ وغیرہ۔ میرے اپنے خیال میں سب سے زیادہ جو چیز آج کل سِتم قاتل ثابت ہو رہی ہے وہ فحش لٹریچر ہے جو ہر گھر میں نقب لگا کر پہنچ جاتا ہے۔ یہ سب سے موذی چیز ہے اور اس کی وجہ سے نہ صرف لڑکیوں کے اخلاق پر بُرا اثر پڑتا ہے بلکہ اُن کی صحت بھی تباہ ہوتی ہے اور شاید پچاس فیصدی لیکوریا کا مرض ایسے لٹریچر کا براہ راست نتیجہ ہے لڑکے تو تباہ ہوئے ہی تھے اب لڑکیاں بھی برباد ہونے لگیں۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَ اِنَّا اِلَیہِ رَاجِعُون۔

## (113) مچھلی کا کانٹا گلانا

ایک دِن میں ایک بڑے سرکاری افسر کے ہاں مہمان تھا۔ ہم چند آدمی کھانے پر تھے اور کھانے میں مچھلی بھی تھی۔ باورچی بھی داد لینے کے لئے وہیں پاس کھڑا تھا۔ اتنے میں مچھلی کے متعلق کسی نے کہا کہ ''اس میں تو بہت کانٹے ہیں'' میزبان نے باورچی سے کہا ''تو بے کانٹوں کی مچھلی کیوں نہیں لایا'' کہنے لگا ''آج تو مہمانوں کی بابت معلوم نہیں تھا نہ خیال تھا ورنہ فرصت ملتی تو میں اسی مچھلی کے کانٹے گلا دیتا'' اس پر مہمانوں میں بحث چل



پڑی کہ آیا کانٹا گل سکتا ہے یا نہیں؟ بعض کہتے تھے کہ گل سکتا ہے مگر میں نے کہا کہ کئی دفعہ میں نے طرح طرح کی کوشش کی اور کئی نسخے اور ترکیبیں استعمال کیں مگر کانٹا گلنا امرِ محال ہے البتہ کتابوں میں پڑھا ہے مگر میں اسے غلط سمجھتا ہوں'' باورچی جھٹ بول اُٹھا کہ ''اچھا میں کل صبح ہی مچھلی لے آؤں گا اور شام کے دسترخوان پر آپ کو گلے ہوئے کانٹے دکھا دوں گا۔ معلوم ہوتا ہے حضور کو کوئی کاریگر اور استاد باورچی نہیں ملا ورنہ کانٹا نہ گلنے کے کیا معنی۔ ہم نے انہیں ہاتھوں مچھلی کی کنگھیاں گلا دی ہیں کانٹا تو کانٹا رہا'' میں نے کہا ''میں جب تک آزما نہ لوں اور ایسی مچھلی خود نہ کھا لوں تب تک ماننا مشکل ہے'' باورچی ہوا کے گھوڑے پر سوار تھا کہنے لگا ''ہاتھ کنگن کو آرسی کیا ہے حضور کل شام کو ہی ملاحظہ فرما لیں گے لیکن خرچ ایسی مچھلی پر زیادہ ہوتا ہے'' میزبان بولے ''جو چاہے خرچ مجھ سے لے لے اور اپنی پسند کی مچھلی بازار سے خود لے آ لیکن اگر کانٹا نہ گلا تو پھر؟ باورچی کے منہ سے بے اختیار نکلا ''سو جوتے'' میزبان بولے ''منظور لیکن اگر کانٹا نہ گلا تو پھر معافیاں نہ مانگیو نہ یہ لوگ تیری سفارش کریں میں بغیر جوتے لگائے نہ چھوڑوں گا کہو منظور ہے؟ ''اُس نے کہا ''منظور'' اور معاملہ طے ہو گیا۔ دوسرے دِن شام کو کھانے کا وقت آیا تو مچھلی بھی آئی اور باورچی بھی مگر اس کا منہ لٹکا ہُوا تھا۔ سب سے پہلے ہم نے مچھلی پر ہی ہاتھ بڑھایا ''ارے یہ کیا! ایک بھی ٹکڑا سلامت نہیں۔ یہ چُورہ چُورہ کیوں کر دی؟'' خیر مچھلی کو ٹٹولا تو کنگھی بھی سلامت اور کانٹے بھی موجود، نرمی تک نہیں آئی تھی ''کیوں بھئی خانساماں! یہ کیا ہُوا ہے؟ کہنے لگا ''مچھلی تو صبح ہی لے آیا تھا اور سب مصالحے جو میرے علم میں تھے وہ بھی۔ تمام دِن پکتی بھی رہی۔ دَم بھی دیا۔ پہلے ایک مصالحہ ڈالا، ناکام رہا، پھر دوسرا ڈالا، بے نتیجہ، پھر تیسرا ڈالا،

مطلب نہ حاصل ہوا، پھر لوگوں سے پوچھ پوچھ کر اور دوسرے کاریگر باورچیوں سے مشورے کر کے اصلاح کی مگر کچھ بھی نہ ہوا‘‘۔

یہ سُن کر ہم نے وہ مچھلی کھانی شروع کی تو معلوم ہُوا کہ کھانے کے قابل بھی نہیں۔ اس قدر ترشی، تلخی، کڑواہٹ اور تیزی مختلف مصالحوں اور دواؤں کی وجہ سے اس میں پیدا ہوگئی تھی کہ اس کا کھانا محال تھا۔ باورچی کہنے لگا کہ ’’علاوہ دَم پخت کرنے کے میں نے اس میں برابر کا دہی ڈالا ہے، پھر نوشادر چھڑکا ہے۔ اس کے بعد انجیر پیس کر ڈالا۔ پھر بھی کانٹا نہ گلا تو کھچری بازار سے لا کر ڈالی۔ آخر میں کسی باورچی سے بگلے کی ہڈی بھی لا کر شامل کی۔ ایک ڈاکٹر سے گوشت ہضم کرنے کی دوا ملی تھی وہ بھی ڈال دی۔ پپیتے کے بیج بھی پیس کر ملائے۔ سرکہ بھی چھڑکا اور پیاز لہسن کا پانی بھی بھرا۔ غرض سب کچھ کر لیا مگر کچھ نہ ہوا‘‘ میزبان فرمانے لگے ’’لا وہ میرا سلیپر اٹھا دے اور سر ننگا کر کے میرے سامنے بیٹھ جا۔ تو نے بھی میرا مُدتوں سے ناک میں دم کر رکھا تھا۔ آج تو میں بھی تیرا کانٹا گلا کر دِل ٹھنڈا کر لوں‘‘ ہم لوگوں نے سفارش بھی کی مگر وہ کب ماننے والے تھے۔ غرض ہمارے سامنے ہی انہوں نے اس کی چندیا پر پورے سو (100) سلیپر گِن ڈالے۔

## (114) آپریشن

یورپ کی ڈاکٹری کا ایک کمال سرجری یعنی جرّاحی کا علم بھی ہے۔ اس کے متعلق ایک عجیب بات یہ میرے تجربے میں آئی کہ تین قسم کے لوگ ہیں جو بہ نسبت اور لوگوں کے آپریشنوں سے بہت ڈرتے ہیں (1) ڈاکٹر (2) پولیس کا سپاہی اور (3) قصائی۔ ان لوگوں کو بحیثیت جماعت کے میں نے دیکھا کہ



آپریشن کی میز پر لیٹنے سے ان کا دم نکلتا ہے اور میرے نزدیک یہ اس لائن میں سب سے بزدل واقع ہوئے ہیں۔ دوسروں پر تو شیر ہوتے ہیں مگر جب اپنے جسم پر زخم لگنے کی باری آئے تو ان کا خون خشک ہو جاتا ہے یا شاید اپنے اعمال سامنے آ جاتے ہیں۔ واللہ اعلم۔

ڈاکٹروں کا وہم بھی اپنی بیماریوں کے متعلق دوسرے لوگوں سے بہت زیادہ ہوتا ہے۔ خود کسی کو بخار چڑھے تو فوراً پہلے دِن ہی ٹائیفائیڈ تشخیص ہو جاتا ہے اور ذرا سی حرارت ہو تو تیسرے دِن تک سِل دق کا یقین کر لیتے ہیں۔ چھوٹی سے پھنسی ہو تو کاربنکل اور کینسر یعنی سرطان سے ورے نہیں ٹھہرتے، ذرا بدہضمی ہوئی اور دِل پر بوجھ محسوس کیا تو حرکتِ قلب بند ہونے میں کوئی شبہ نہیں رہتا۔

ایک ڈاکٹر صاحب کے ہونٹ پر ذرا سی پھنسی نکلی۔ چند دِن مرہم لگایا پھر کاسٹک وغیرہ ٹچ کیا۔ پھر اپنے شفاخانہ سے بے رخصت لئے تار روانہ کر کے لاہور چلے گئے اور محکمہ کے افسر بالا اور سب رشتہ داروں کو اطلاع کر دی کہ ’’مجھے سرطان یعنی کینسر ہوگیا ہے۔ میں لاہور جا رہا ہوں‘‘ وہاں جا کر معلوم ہُوا کہ معمولی لاہورسور یعنی اورنگ زیبی پھوڑا ہے۔ اتنے میں ان کے سب رشتہ دار بھی روتے پیٹتے پہنچ گئے مگر جب حقیقت حال معلوم ہوئی تب شرمندہ ہوئے۔

آج سے تیس سال پہلے آپریشن کے وقت ربڑ کے دستانے پہننے کا رواج نہ تھا اس لئے میرے علم میں چند موتیں نوجوان ڈاکٹروں کی اس وجہ سے بھی ہوئیں کہ دوران آپریشن میں ان کی انگلی پر خراش ہو کر مریض کا زہریلا مواد اس خراش میں لگ گیا تھا اور صرف تین چار دِن بیمار رہ کر اور زہر چڑھ کر وہ ڈاکٹر فوت ہو گئے۔ ایک ڈاکٹر صاحب دس روز کی اتفاقی رخصت لے کر

شملہ سیر کرنے گئے وہاں گلے میں تکلیف ہوگئی۔ شفاخانہ میں دکھایا۔ انہوں نے کہا ٹانسل بڑھ گئے ہیں ان کا آپریشن کرا لو۔ چنانچہ کرا لیا۔ اس کے بعد کوئی تکلیف تو نہ ہوئی مگر خون گلے میں سے جاری رہا اور وہ اسے نگلتے رہے۔ نہ انہیں پتہ لگا اور نہ دوسروں کو۔ شام کے قریب بڑی بھاری قَے خون کی ان کو آئی اور پیشتر اس کے کہ طبی امداد پہنچ سکے وہ ختم ہو گئے۔ اسی طرح ایک اور ڈاکٹر صاحب جو عمر رسیدہ تھے ٹانسل کو بالکل معمولی سمجھ کر اور اپنی عمر اور دِل کی کمزوری کا خیال کیے بغیر گلے کے آپریشن کے لئے شفاخانہ میں داخل ہو گئے۔ ابھی تین چار سانس کلورا فارم کے بھی نہ لئے تھے کہ آپریشن سے پہلے ہی دم نکل گیا۔

میری اپنی پریکٹس میں دو (2) آدمی کلورا فارم سے میز پر مرے ہیں اور دونوں دفعہ ان کو کلورا فارم دینے والے ایسے کمپونڈر تھے جنہوں نے پہلے یہ کام کبھی نہیں کیا تھا۔ ایک شخص کی تو کولہے کی ہڈی کا جوڑ اُکھڑ گیا تھا میں اسے چڑھا رہا تھا کہ وہ رخصت ہوا۔ بڈھا آدمی تھا اور جوڑ چڑھانے کے لئے پٹھے اور عضلات پورے ڈھیلے کرنے کے لئے معمولی سے زیادہ کلورا فارم درکار تھا۔ نیا کمپونڈر تھا جس نے کبھی پہلے یہ کام نہیں کیا تھا۔ دوسرا ایک پانچ چھ سال کا بچہ تھا جس کی پتھری کا آپریشن تھا اور پتھری بجائے کاٹ کر نکالنے کے توڑ کر نکالی جا رہی تھی، اِسے بھی ایک بالکل نیا کمپونڈر کلورا فارم دے رہا تھا کہ سانس بند ہوگیا۔ پھر بہتیرا مصنوعی تنفس دیا گیا اور جو بھی ترکیبیں سانس لانے کی ہوتی ہیں سب استعمال کی گئیں مگر وہ چل ہی بسا۔ اس قسم کی موتوں سے رشتہ داروں کو جس قدر صدمہ ہوتا ہے اس کا بیان لاحاصل ہے۔ آپریشن کے کمرہ میں انسان زندہ جاتا ہے اور مردہ واپس آتا ہے۔ اس وجہ سے یہ ضروری ہے کہ ہر بڑے شفاخانہ میں ڈاکٹر کلورا فارم دیا کریں اور وہ خاص



اس فن کا امتحان دے کر اپنے کام پر مامور کیے جائیں۔ اگر ڈاکٹر اتنے نہ مل سکیں تو جو کمپونڈر بھی لگائے جائیں اُن کی خاص تربیت اور ٹریننگ اس فن میں کرا کر امتحان لے کر پھر کچھ زائد الاؤنس دے کر ان کو اپنی ڈیوٹی پر مامور کیا جائے۔

بعض لوگوں نے آپریشن کو بھی ایک مذاق سمجھ رکھا ہے خصوصاً اپنڈکس کے آپریشن کو۔ ذرا سی تکلیف محسوس کی تو خیال کر لیا کہ یہ ناقابلِ علاج مرض ہے اور آپریشن کے سوا اچھا نہیں ہوسکتا۔ اس لئے بغیر کافی مُدت اور مناسب علاج کئے فوراً آپریشن کے لئے تیار ہو جاتے ہیں اور پھر اس آپریشن کو کھیل سمجھتے ہیں حالانکہ دونوں باتیں غلط ہیں۔ نہ سوائے خاص حالات کے آپریشن ضروری ہے نہ یہ آپریشن کھیل ہے۔ میں نے بیسیوں مریض پیٹ کے درد کے ایسے دیکھے ہیں جنہوں نے اپنا اپنڈکس کٹوا لیا مگر درد پھر بھی جوں کا توں باقی رہا۔

یہی حال کاربنکل (سرطان) کے پھوڑے کا ہے۔ ہر کاربنکل کے لئے آپریشن ضروری نہیں ہوتا مگر عام طور پر کئی ڈاکٹر اور اکثر لوگ کاربنکل اور آپریشن کو لازم و ملزوم سمجھتے ہیں۔ اسی طرح آج کل دانت نکلوانے کا حال ہے۔ دانت میں ذرا درد ہُوا یا ذرا سی پیپ کا شبہ ہُوا یا ذرا سا بھی ہلا تو ڈاکٹر یہی کہتے ہیں کہ ’’جھٹ نکالو، فوراً نکالو ورنہ مر جاؤ گے۔‘‘

کرنال میں ایک انگریز ڈپٹی کمشنر تھے۔ ان کو بدہضمی کی شکایت رہتی تھی اور دِل گھٹتا جاتا تھا۔ ضعف قلب کے لئے وہ روزانہ بیس پچیس انڈے کچے کھایا کرتے تھے اور کمزور ہو جانے کے خوف سے یوں بھی بے حد غذا کھاتے تھے۔ ان کی ساری بیماری پُرخوری کی وجہ سے تھی۔ ایک دفعہ وہ دس روز کے لئے شملہ رُخصت پر گئے۔ واپس آئے تو ان کے خانساماں نے مجھے بتایا

کہ ہمارے صاحب اپنی ساری بتیسی شملہ میں ایک دندان ساز سے نکلوا آئے ہیں اور کہتے ہیں ''اب میں بالکل اچھا ہو گیا ہوں، اب دِل کا دورہ اور پیٹ کا نفخ نہیں ہو گا'' میں نے کہا ''اچھا ہے لیکن اگر کوئی تکلیف ہو جائے تو مجھے اطلاع ضرور دینا'' ابھی تین دِن نہیں گزرے تھے کہ خانساماں دوڑا آیا کہ صاحب کا تو دِل کے دورے کے مارے بُرا حال ہے اور وہ سارے دندان سازوں کو لیٹے لیٹے گالیاں دے رہے ہیں'' میں نے اُسے کہا کہ ''صاحب کو کہو کہ انڈے کھانے اور کئی دفعہ کھانا کھانا چھوڑ دیں۔ دانت بیچارے تو مفت میں بدنام ہیں۔''



## ضمیمہ آپ بیتی

حضرت ڈاکٹر میر محمد اسمٰعیل صاحب کا لکھا ہُوا مضمون ختم ہو گیا مگر کاپی میں گنجائش کچھ باقی رہ گئی، اس لئے محض جگہ پر کرنے کے لئے میں خود دو فسانے لکھ کر یہاں درج کر رہا ہوں۔ اگرچہ میری تحریر میں قارئین کرام کو وہ لطف ہرگز نہیں آئے گا جو حضرت میر صاحب کی آپ بیتی سے اُٹھا چکے ہیں۔

راقم (شیخ) محمد اسمٰعیل پانی پتی

# (115) دوخون

گاؤں کی ساری لڑکیوں میں لاجونتی سب سے زیادہ چاق و چوبند، مضبوط اور طاقتور تھی۔ زندہ دلی اور خوش مزاجی اُس کی گھٹی میں پڑی ہوئی تھی۔ جب دیکھو سہیلیوں کے ساتھ ہنستی کھیلتی رہتی تھی۔ شوقین مزاج بھی بے حد تھی۔ اچھا کھاتی اور اچھا پہنتی۔ غرض بڑی بے فکری سے اپنی زندگی گزار رہی تھی۔ اٹھارہ (18) برس کی عمر ہوئی تو ماں باپ نے ایک کھاتے پیتے گھرانے میں شادی کر دی مگر سُسرال پہنچ کر بیچاری کی ساری زندہ دِلی اور شوقین مزاجی ختم ہوگئی۔ نہ بولنے کا مقدور تھا نہ بات کرنے کی اجازت۔ سسرال والے سارے کے سارے اکھڑ، بدمزاج اور گنوار کا لٹھ واقع ہوئے تھے۔ بولتے تو درشت مزاجی کے ساتھ، بات کرتے تو سختی سے۔ غرض نہ کوئی نرمی سے گفتگو کرنے والا تھا نہ مہربانی کے ساتھ سلوک کرنے والا۔ کنبہ بہت سا تھا اور خاندان کے سب لوگ ایک ہی مکان میں رہتے تھے۔

لاجونتی زندہ دِل اور شوقین مزاج بے شک تھی مگر زبان دراز اور شوخ چشم نہ تھی۔ طبیعت نہایت نیک پائی تھی۔ بیچاری رہ رہ کر سوچتی تھی کہ ایسے بدمزاج لوگوں میں میری زندگی کس طرح بسر ہوگی؟ تاہم اس نے فیصلہ کر لیا تھا کہ جس طرح بھی بنے گا خندہ پیشانی کے ساتھ ہر مصیبت سہوں گی اور اُف نہ کروں گی۔ خاندان کے ہر فرد کی سختی برداشت کروں گی اور شکایت نہ کروں گی۔

گھر والوں کا برتاؤ لاجونتی کے ساتھ شروع ہی سے سختی کا تھا، کوئی اُس سے سیدھے منہ بات نہ کرتا تھا مگر لاجونتی ہر ایک سے خوش اخلاقی سے پیش آتی اور جہاں تک ممکن ہوتا کسی کو اپنے سے شکایت کا موقع نہ آنے دیتی۔ غرض دو تین مہینے ہَر پٹ کر بُری بھلی طرح بسر ہو ہی گئے۔



نہ کبھی مصیبت تنہا آتی ہے اور نہ کبھی بدقسمتی کہہ کر آیا کرتی ہے۔ ایک روز بیٹھے بیٹھے بالکل اتفاقیہ طور پر لاجونتی کا دِل لڈو کھانے کو چاہا محلے کا ایک بچہ گھر میں کھیل رہا تھا لاجونتی نے اُسے بُلایا اور بلا کسی خاص خیال کے بالکل معمولی بات سمجھتے ہوئے گھر میں پڑے ہوئے اناج کے ذخیرے میں سے کوئی آدھ سیر کے قریب غلہ لے کر لڑکے کو دیا اور اُس سے کہا کہ ''گاؤں کے حلوائی سے مجھے اس کے لڈو لا دے'' لڑکا گیا اور تھوڑی دیر میں چھوٹے چھوٹے چھ سات لڈو لا کر لاجونتی کے حوالے کر دیئے۔

لڑکے کو غلہ لے جاتے ہوئے اور لڈو لاتے ہوئے اتفاقاً لاجونتی کی نند نے دیکھ لیا تھا۔ اس نے فوراً جا کر ماں سے کہا کہ ''آج بھابی نے ذخیرے سے غلہ لے کر لڈو منگائے ہیں۔ وہ ہر روز ہی غلہ کے بدلے کچھ کچھ منگاتی رہتی ہیں اور کوٹھڑی میں گھس کر چپکے چپکے کھا لیتی ہیں۔ گھر میں جو کچھ ہے اب تو انہی کی تلڑ میں اُترے گا۔ ہمارے نصیب کا تو اس گھر میں کچھ بھی نہ ہوا۔ میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ دھڑی بھر سے زیادہ غلہ انہوں نے کچھمن کے ہاتھ بھیجا اور لڈو منگوائے''۔

بیٹی سے یہ سنتے ہی لاجونتی کی ساس آگ بگولا ہوگئی۔ بدنصیب بہو نے ابھی پہلا ہی لڈو منہ میں رکھا تھا کہ یہ بلائے بے درماں کی طرح اُس کے سر پر پہنچ گئی اور ایک زور کا دوہتڑ لاجونتی کی کمر میں مار کر کہنے لگی کہ ''آج معلوم ہُوا کہ یہ غلہ روز بروز کیوں گھٹتا جا رہا ہے؟ یہ تو اس چٹورپن کی بھینٹ چڑھ رہا تھا۔ مَیں بھی حیران تھی کہ آخر یہ غلہ جاتا کہاں ہے؟ اپنے خصم کو آنے دے اس چٹورپن کا تجھے کیسا مزا چکھاتی ہوں''۔

ساس کا چیخنا سُن کر لاجونتی کی دیورانی بھی دوڑ کر اپنے دالان سے آ گئی اور صورت معاملہ دیکھ کر کہنے لگی 'ایسا چٹورپن بھی کس کام کا جس سے گھر

ہی کا صفایا ہو جائے؟ جیٹھانی روٹی پکا رہی تھی وہ وہیں سے بیٹھی بیٹھی بولی ''زبان کا مزا آخر کہاں جائے، ماں باپ نے ہنر سلیقہ تو خاک نہ سکھایا ہاں ملائیاں مٹھائیاں کھانی البتہ سکھا دی ہیں۔ بیچاری کیا کرے، مجبور ہے روٹی تو اسے ملتی ہی نہیں اب مٹھائیاں منگا منگا کر نہ کھائے تو غریب کا پیٹ کس طرح بھرے؟''

عین اس وقت جبکہ گھر کی ہر عورت لاجونتی کو بُرا بھلا کہہ رہی اور اسے طعنے تشنے دے رہی تھی لاجونتی کا خسر باہر سے آ گیا۔ جونہی اس نے دروازہ میں قدم رکھا، بیوی نے اُسے آواز دی اور کہا ''ذرا یہاں تو آؤ'' اس نے پوچھا ''کیا جھگڑا ہے؟'' بیوی بولی ''جھگڑا کچھ بھی نہیں۔ اب اپنے گھر بار سے ہاتھ دھوؤ اور جو کچھ جمع پونجی ہے شوقین مزاج بہو کے حوالے کر کے بھیک کا ٹھیکرا ہاتھ میں لے لو۔ یہ دیکھو اس نے پانچ سیر غلہ بھیج کر لڈو منگوائے، بیٹھی کھا رہی تھی۔ ذرا سے رہ گئے تھے کہ اتفاق سے میں ادھر آ نکلی۔ مَیں نے تم سے پہلے کہا نہیں منوں غلہ اب تک تمہاری یہ چہیتی بہو اسی طرح اُڑا چکی ہے۔ فصل میں ابھی تین مہینے پڑے ہیں اور گھر میں غلہ پندرہ دِن کا بھی باقی نہیں رہا۔ اب فصل آنے تک یا تو فاقے کرو یا بھیک مانگو''۔

یہ سنتے ہی خسر کو سخت غصہ آیا اور کہنے لگا کہ ''ہماری قسمت پھوٹ گئی جو ایسی چٹوری بہو ہمارے پلے پڑی ہمیں خبر ہوتی کہ اس کو زبان کا ایسا چسکا ہے تو کبھی بھول کر بھی اسے گھر نہ لاتے۔ اب تو یہ ساری عمر کا جلاپا ہمارے نصیب میں لکھا گیا''۔

لاجونتی کا دیور اس وقت پڑا ہُوا سو رہا تھا شور سے اُس کی آنکھ کھل گئی وہ آنکھیں ملتا ہُوا آیا تو ماں اس سے کہنے لگی تو اپنی بھابی کی بڑی تعریفیں کیا کرتا تھا اب دیکھ اپنی بھابی کی کرتوت! ذرا غلہ ختم ہو لے تو پھر گہنے پاتے کی



باری آئے گی اور اس طرح آہستہ آہستہ سارے گھر کی صفائی ہو جائے گی۔ دیور نے بگڑ کر جواب دیا ''میں نے کس دِن ان کی تعریفیں کی تھیں؟ میں تو ان کے لچھن شروع ہی سے دیکھ رہا تھا مگر زبان سے اس لئے نہ کہتا تھا کہ بھائی کو بُرا لگے گا۔ باقی میرا تو یہی خیال ہے کہ ایسی چٹوری عورت گاؤں بھر میں نہ ہو گی۔

جیٹھ کھیت سے آیا تو اس نے خلاف معمول سارے گھر کو ایک ہی جگہ جمع دیکھ کر کہا ''خیر تو ہے کیا بات ہے؟ باپ بولا ''خیر کہاں، خیر ہوتی تو ہم اس بہو کو بیاہ کر ہی کیوں لاتے۔ جب سے یہ گھر میں آئی ہے گھر کا ستیاناس ہو گیا ہے۔ خبر نہیں یہ بلا ہمارے سر سے کب ٹلے گی؟ مر جائے تو پاپ کٹ جائے'' جیٹھ نے پوچھا ''آخر بات تو بتاؤ قصہ کیا ہے؟'' ماں بولی ''تجھے دکھائی نہیں دیتا۔ سامنے لڈو پڑے ہیں بس یہی قصہ ہے اور کچھ بھی نہیں۔ روزمرہ بہو محلے کے بچوں کے ہاتھ غلہ نکال کر بھیج دیتی ہے اور مٹھائیاں منگا کر کھا لیتی ہے۔ اس کی بلا سے چاہے گھر میں تنگی ہو چاہے فاقہ اسے تو اپنے حلوے مانڈے سے کام'' اس پر جیٹھ بولا ''جو سارا دِن کام دھندا کچھ نہ کرے گی اور پڑی ہوئی اینڈتی رہے گی وہ جو کچھ نہ کر گزرے تھوڑا ہے اور ابھی کیا ہے آگے آگے دیکھنا کیا کیا گل کھلتے ہیں۔ یہ بہو تو تمہارا اچھی طرح سر مونڈ کر رہے گی۔''

نندوئی کچھ سودا سلف لینے شہر گیا ہُوا تھا وہ بھی لدا پھندا اتفاق سے اسی وقت گھر پہنچا اور قصہ سُن کر کہنے لگا ''اسے زباں کا اس قدر مزا ہے تو تھوڑا سا زہر ہی کھلا دو۔''

اس وقت سارا گھر لاجونتی کو گھیرے کھڑا تھا۔ گھر والوں میں سے کوئی بھی ایسا نہ رہا تھا جس نے لاجونتی کو بُرا بھلا کہہ کر اپنے دِل کا بخار نہ نکالا ہو

مگر مظلوم و بے بس لاجونتی بالکل خاموش اور چپ تھی نہ نظر اوپر اٹھا کر کسی کو دیکھتی تھی نہ کسی بات کا جواب دیتی تھی۔ جو لڈو اس نے منہ میں ڈال لیا تھا وہ منہ ہی میں رہا اس نے اُسے نہ نگلا نہ تھوکا۔ وہ تصویرِ حزن و ملال بنی بیٹھی تھی۔ اس کا دِل رو رہا تھا مگر آنکھیں خشک تھیں زبان سے آہ نہ کرتی تھی مگر دِل سے دھواں اُٹھ رہا تھا وہ گردن جھکائے بیٹھی تھی اور ساری کرخت اور سخت آوازیں سُن رہی تھی کہ اتنے میں خاوند بھی باہر سے آ گیا اور لاجونتی کے گرد گھر والوں کا جمگھٹا دیکھ کر سیدھا ادھر ہی چلا آیا۔ ماں تو اس کی منتظر ہی تھی دیکھتے ہی بولی ''اچھا ہُوا تو جلدی آ گیا بات یہ ہے کہ ہم تو تیری نئ نویلی دلہن کے ہاتھوں اب سخت تنگ آ گئے ہیں۔ اس کے چٹورپن نے گھر کے سارے غلہ کو تو ختم کر ہی دیا اب کچھ دنوں میں گھر کا سب مال و اسباب بھی غلہ کی طرح غائب ہو جائے گا اور پتہ نہیں لگے گا کہ کہاں گیا۔ بھلا غضب نہیں تو اور کیا ہے کہ آج پانچ چھ سیر غلہ کے لڈو اس نے منگائے اور سب اکیلی بیٹھ کر ہڑپ کر گئی۔ یہ دو چار باقی تھے کہ میں پہنچ گئی۔ یہ آج کچھ نئ بات نہیں جب سے غلہ گھر میں آ کر پڑا ہے تب سے روز غلہ کی مٹھائیاں آتی ہیں اور مزے میں کھائی جاتی ہیں۔ خبر نہیں پیٹ ہے یا دوزخ کہ کسی طرح بھرنے ہی میں نہیں آتا۔ ایسی چٹوری عورت میں نے آج تک کوئی نہیں دیکھی۔ روٹی کھانی اس نے بالکل چھوڑ دی ہے۔ جب بھوک لگی کوٹھڑی میں بڑی اور مٹھائی کھا لی۔ منہ صاف کیا اور باہر چلی آئی۔ آخر اس طرح کب تک گزارہ ہوگا؟ اور گھر کب تک لٹتا رہے گا؟ سچی بات تو یہ ہے کہ ہم تیرا بیاہ ایسی چٹوری اور منحوس لڑکی سے کر کے بہت ہی پچھتائے۔ یہ تو کچھ ہی دنوں میں بھرے گھر کا صفایا کر کے رکھ دے گی۔''

بیٹا آخر اپنی ماں ہی کا لڑکا تھا وہ غصہ اور طیش میں اپنی والدہ محترمہ



سے کس طرح پیچھے رہ سکتا تھا۔ یہ سنتے ہی اس نے آؤ دیکھا نہ تاؤ چولھے میں سے جلتی ہوئی لکڑی کھینچ تین چار زور زور سے بیوی کے ایسی لگائیں کہ وہ تڑپ اُٹھی اور کہنے لگا ''دفع ہو یہاں سے جا اپنے میّا باوا کے ہاں جنھوں نے تجھے ایسا چٹورا بنایا۔ ہمارے گھر میں ایسی چٹوری عورت کا گزارہ نہیں ہو سکتا۔ خبردار اب اس گھر میں قدم مت رکھیو۔ اگر حیادار ہوگی تو کنویں میں ڈوب مریو مگر ہمیں اپنی شکل نہ دکھائیو۔ اب یہاں بیٹھی ہوئی کیا اپنے اماں باوا کو رو رہی ہے۔ چل اُٹھ اور نکل یہاں سے یہ کہہ کر دو تین لکڑیاں اس کے اور ماریں اور ہاتھ پکڑ کر کھڑا کر دیا۔

لاجونتی سارے گھر کا بُرا بھلا سُن رہی تھی مگر اسے خفیف سی امید اس بات کی تھی کہ شوہر آئے گا تو شاید میرے ساتھ کچھ نرمی کا برتاؤ کرے مگر وہ آیا تو اس نے سب ہی پر پڑا دے مارا۔

بیوی کے ساتھ بیٹے کا یہ سلوک دیکھ کر ماں کی باچھیں کھل گئیں اور بے اختیار اس کے منہ پر ہنسی آ گئی۔

جب شوہر نے ہاتھ پکڑ کر بیوی کو کھڑا کر دیا تو لاجونتی نے نظر اوپر اٹھائی اور غضبناک شوہر کی طرف ایسی التجا اور حسرت کے ساتھ دیکھا کہ سنگدل سے سنگدل انسان کا دِل بھی نرم پڑ جاتا مگر بے درد خاوند پر کچھ اثر نہ ہوا۔ وہ بڑے غصے کے ساتھ بیوی کو دروازے تک گھسیٹتا ہُوا لے گیا اور وہاں پہنچ کر زور سے ایک لات اس کی کمر میں ماری اور دروازہ بند کر کے واپس آ گیا۔

مظلوم، مجروح اور مضروب لاجونتی نے مڑ کر شوہر کے مکان پر اس مکان پر جہاں اس نے سہاگ کے دو تین مہینے بہت تکلیف اور مصیبت کے ساتھ بسر کئے تھے ایک نگاہ ڈالی اور خاموشی کے ساتھ آہستہ آہستہ روانہ ہوگئی۔

اس کا جسم جلتی ہوئی لکڑی کی چنگاریوں سے جگہ جگہ سے جل گیا تھا۔ اس کا تمام بدن لکڑی کی ضرب سے زخمی ہو گیا تھا۔ اس کے کپڑے لکڑیوں میں الجھ کر پھٹ گئے تھے مگر وہ اسی حالت میں خاموشی کے ساتھ آگے چلتی گئی۔ اس نے فیصلہ کرلیا تھا کہ اب اسے کیا کرنا چاہیے؟

تین چار منٹ میں وہ اس کوئیں پر پہنچ گئی جس سے سارے گاؤں کی عورتیں پانی بھرا کرتی تھیں مگر اتفاق سے اس وقت کوئی عورت وہاں موجود نہ تھی۔ لاجونتی نے یہ دیکھ کر اطمینان کا سانس لیا۔ وہ کوئیں کی من پر بیٹھ گئی اور چاروں طرف نظر دوڑانے کے بعد اس نے اپنے کپڑے اتارنے شروع کئے۔ جب اتار چکی تو ایک اینٹ ان پر رکھ دی تا کہ کپڑے ہوا سے اُڑ کر کوئیں میں نہ جا پڑیں۔ اس کے بعد کھڑی ہوئی اور ایک چھلانگ میں کوئیں کی تہہ میں پہنچ گئی۔

موت کا تلخ اور کڑوا پیالہ تھا جو جاہل گھر والوں اور ظالم شوہر کے ہاتھوں نہایت حسرت و الم کے ساتھ بدنصیب لاجونتی کو پینا پڑا۔ اتنی ذلت، اتنی بے عزتی اور اس قدر سبّ وشتم کے بعد اس کی غیرت وحمیّت نے گوارا نہ کیا کہ وہ اس پر مصائب دُنیا میں زندہ رہے اور مزید تکالیف برداشت کرے۔

جب لاجونتی کی لاش گاؤں سے پوسٹ مارٹم کے لئے شہر کے سرکاری شفاخانے میں پہنچی تو میں اس وقت اسسٹنٹ سرجن صاحب کے پاس بطور مہمان مقیم تھا۔ میں نے کہا ''ڈاکٹر صاحب! میں نے آج تک کبھی پوسٹ مارٹم ہوتے نہیں دیکھا خواہش ہے کہ ایک دفعہ دیکھوں۔ اس وقت اتفاق سے یہ موقع آ گیا ہے مجھے بھی ساتھ لے چلیں'' ڈاکٹر صاحب نے فرمایا ''نظارہ سخت ہوتا ہے اور تم نرم دِل ہو'' میں نے کہا ''میں برداشت کر



لوں گا'' فرمانے لگے ''اچھا چلو'' چنانچہ ہم دونوں لاش گھر پہنچے۔ شوہر اور سسرے وغیرہ میں سے تو کوئی ساتھ نہ تھا۔ نمبردار اور گاؤں کے دوسرے لوگوں سے جو ارتھی کے ساتھ آئے تھے جب ڈاکٹر صاحب نے متوفیہ کی موت کا سبب پوچھا تو انہوں نے کچھ تامل کے ساتھ وہ دردناک کہانی بیان کی جو آپ نے اوپر پڑھی۔

لاش کا پوسٹ مارٹم شروع ہوا۔ میں پاس کھڑا تھا۔ سر کی کھوپڑی اُتاری گئی سینہ چیرا گیا۔ پیٹ چاک کیا گیا۔ آنتیں، پھیپھڑے اور گردے نکالے گئے۔ معدہ دیکھا گیا۔ یہ ہیبت ناک نظارہ میرے لئے واقعی بہت سخت تھا مگر جس طرح بنا دِل پر جبر کئے میں پاس کھڑا دیکھتا رہا اور بدنصیب لاجونتی کو جوان مرگی پر افسوس کرتا رہا۔ یکا یک ڈاکٹر صاحب نے کہا ''اسمٰعیل! یہ دیکھو کیا ہے؟'' میں نے گھبرا کر جو گردن موڑی تو میز پر ایک شفاف جھلی رکھی تھی۔ جو ڈاکٹر صاحب نے رحم میں سے نکالی تھی۔ میں نے دیکھا کہ جھلی میں پانی بھرا ہُوا ہے اور پانی کے بیچ میں چاول کے برابر ایک چھوٹا سا پتلا تیر رہا ہے۔ یہ معلوم ہوتا تھا کہ چینی یا ہاتھی دانت کی ایک بہت خوشنما تصویر ہے۔ تعجب اس بات کا تھا کہ اتنے چھوٹے سے پتلے میں تمام انسانی اعضاء بالکل صاف صاف اور نمایاں نظر آ رہے تھے۔

میں نے انتہائی حیرت سے پوچھا ''ڈاکٹر صاحب! یہ کیا ہے؟''

انہوں نے مغموم آواز میں جواب دیا ''کم بختوں نے دو (2) خون کئے۔''

یہ اسسٹنٹ سرجن حضرت ڈاکٹر میر محمد اسمٰعیل تھے جو اس وقت سونی پت ضلع رہتک میں تعینات تھے اور میں ان کے بلانے پر چندروز کے لئے ان کے پاس گیا ہُوا تھا۔

# (116) دِق کا کیڑا

ماسٹر نذیر احمد انداز ایک نہایت ہنس مُکھ اور ہر وقت خوش رہنے والے انسان ہیں مگر نہ معلوم کیا بات تھی کچھ دنوں سے نہایت مضمحل اور تھکے تھکے سے رہنے لگے تھے۔ خفیف بخار بھی انہیں قریباً روزانہ رات کو چڑھ آتا تھا۔ بظاہر اس کی کوئی وجہ معلوم نہ ہوتی تھی۔ آخر اپنی بیماری سے انداز صاحب قدرتاً نہایت پریشان رہنے لگے۔ بخار روز بروز تیزی اختیار کرتا گیا۔ یہاں تک کہ اب اکثر اوقات وہ اسکول بھی نہ آ سکتے اور بستر ہی پر پڑے ہوئے بے چینی کے ساتھ کروٹیں بدلتے رہتے۔ جوان آدمی کو چند روز بھی بخار آ جائے تو اس کے انجر پنجر ڈھیلے ہو جاتے ہیں۔ یہی حال انداز صاحب کا ہوا۔

شروع شروع میں تو انداز صاحب نے اس بیماری کی قطعاً پرواہ نہ کی اور یہی سمجھا کہ معمولی بخار ہے۔ جاتا رہے گا۔ اس لئے علاج معالجہ کی طرف توجہ نہ کی مگر جب بخار نے جانے کی بجائے زیادہ حدّت اور تیزی اختیار کی تو اب انداز صاحب کو درحقیقت فکر پیدا ہوئی۔ چنانچہ ایک دِن علی الصبح وہ ایک مقامی حکیم صاحب کے پاس گئے نبض دکھائی، حال بیان کیا۔ حکیم صاحب نے کچھ سوالات کئے اور پھر فرمایا کہ ''تمہیں دِق ہے۔ تیسرا درجہ شروع ہو گیا ہے۔ بیمار ہوتے ہی کیوں نہ آ گئے اب کچھ نہیں ہو سکتا'' حکیم صاحب کے اظہارِ مرض سے ماسٹر صاحب تو گویا بِن آئی مر گئے۔ نہایت مغموم و مضمحل گھر آئے اور دھڑام سے بستر پر گر پڑے اور لگے سوچنے کہ نہ معلوم زندگی کی کتنی گھڑیاں باقی ہیں۔ خیر شکر ہے کہ ابھی تک شادی نہیں ہوئی ورنہ بیوی بیچاری زندہ درگور ہوتی۔ نتیجہ یہ ہُوا کہ بخار زور کا چڑھ آیا اور انداز صاحب بخار کی شدت میں لگے بہکنے۔ خیر بخار تو شام تک اتر گیا مگر دِق کا خوف ایسا دِل پر چھایا کہ کھانا



پینا سب حرام ہو گیا۔

یہ قصہ پانی پت کا ہے اور انداز صاحب اس وقت حالی مسلم ہائی اسکول پانی پت میں مدرس تھے۔ خیر جب ماسٹر صاحب مدرسے گئے تو وہاں اپنے اور میرے محترم دوست شیخ محمد بدرالاسلام فضلی بی اے۔ بی ٹی سے جو اس وقت اسی ہائی اسکول میں سیکنڈ ماسٹر تھے، سارا واقعہ بیان کیا۔ انہوں نے صلاح دی کہ مقامی شفاخانہ کے اسسٹنٹ سرجن کو بھی دکھا لو دیکھیں وہ کیا کہتے ہیں؟ انداز صاحب شفاخانہ پہنچے اور ڈاکٹر صاحب سے مرض کی تمام کیفیت بیان کی مگر یہ نہ کہا کہ ''اس سے پہلے ایک حکیم صاحب کو بھی دکھا چکا ہوں'' انہوں نے حال غور سے سنا اور پھر کہنے لگے ''مجھے تمہاری جوانی پر رحم آتا ہے مگر یہ کہے بغیر چارہ بھی نہیں کہ تم دِق میں مبتلا ہو۔ دھرم پور جاؤ اور علاج کراؤ شاید بچ جاؤ۔''

یہ کہہ کر ڈاکٹر صاحب اور نسخے لکھنے میں مصروف ہو گئے۔

حکیم جی نے بھی یہی بتایا اور ڈاکٹر صاحب نے بھی یہی تجویز کیا تو اب ماسٹر صاحب کے درد و الم کی انتہا نہ رہی۔ انہیں اپنی موت سامنے نظر آنے لگی اور وہ مرنے کے لئے قریباً تیار ہو کر واپس اسکول آ گئے۔ شفاخانہ سے واپس آ کر ماسٹر صاحب نے فضلی صاحب سے کہا ''لیجئے اب کچھ دنوں میں آپ سے ہمیشہ کیلئے جدائی ہو جائے گی۔ اس نامراد مرض میں مبتلا ہو کر آج تک کوئی بچا بھی ہے جو میں بچوں گا؟''

فضلی صاحب نے اپنے دوست کو بہت تسلی و تشفی دی اور کہنے لگے ''بہت ممکن ہے کہ تشخیص ٹھیک نہ ہوئی ہو اور حقیقتاً تمہیں معمولی بخار ہو جسے غلطی سے دِق سمجھ لیا گیا ہے'' تم ایک کام کرو۔ چھٹی لے کر ایک دِن کے لئے سونی پت جاؤ۔ وہاں کے اسسٹنٹ سرجن ڈاکٹر میر محمد اسمٰعیل صاحب اپنے فن میں

نہایت کامل اور حاذق ہیں انہیں دکھاؤ'' ماسٹر صاحب نے کہا'' جانے کو تو میں تیار ہوں لیکن ان سے سفارش کون کرے؟ فضلی صاحب نے میرا نام لیا اور شام کو ماسٹر صاحب میرے پاس آئے۔ واقعہ بیان کیا اور کہا ''ایک خط ڈاکٹر صاحب کو لکھ دیں'' میں نے حضرت استاذی المحترم ڈاکٹر میر محمد اسمٰعیل کے نام انہیں ایک تعارفی عریضہ لکھ دیا۔ جسے لے کر ماسٹر صاحب دوسرے دِن سونی پت پہنچے۔

رُقعہ پڑھ کر ڈاکٹر صاحب نے فرمایا ''آپ بیٹھ جائیں میں جب روزانہ کے مریضوں سے فارغ ہو جاؤں گا تو اطمینان سے آپ کو دیکھوں گا'' ماسٹر صاحب بیچارے نہایت امید وبیم کی حالت میں کرسی پر بیٹھ کر انتظار کرنے لگے۔

دوپہر کو بارہ (12) بجے کے قریب ڈاکٹر صاحب مریضوں سے فارغ ہوئے تو فرمانے لگے کہ ''ہاں صاحب اب چلئے آپ کا ملاحظہ کروں'' وہ انہیں کمرے میں لے گئے اور ایک میز پر لٹا دیا۔ اپنی جیب سے سینہ دیکھنے کا آلہ نکالا اور بہت غور کے ساتھ ملاحظہ شروع کیا۔ بیچ میں بہت سے سوالات بھی کئے۔ اور آخر میں کہنے لگے ''میں یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ تمہیں نہ تو دِق ہے اور نہ دِق کے آثار ہیں۔''

ماسٹر صاحب: جناب! پانی پت میں تو حکیموں اور ڈاکٹروں نے متفقہ طور پر دِق ہی تجویز کی ہے۔

ڈاکٹر صاحب: ماسٹر صاحب! اپنی اپنی تشخیص ہے۔ مجھے دوسرے کے خیال پر رائے زنی کرنے کا کوئی حق نہیں میں تو آپ کو صرف اپنی رائے بتا رہا ہوں۔''

ماسٹر صاحب: اچھا ڈاکٹر صاحب! اگر مجھے دِق نہیں تو پھر ہمیشہ بخار



کیوں رہتا ہے۔

ڈاکٹر صاحب: اس کی وجہ میں ابھی پانچ منٹ میں آپ کو بتائے دیتا ہوں۔ آپ ذرا بالکل سیدھے لیٹ جائیں اور منہ کھول لیں۔''

یہ کہہ کر ڈاکٹر صاحب نے شیشے کی الماری میں سے ایک بیحد چمکدار اور نہایت باریک تار جو شاید جست کا تھا یا تانبے کا یا شاید اور کسی دھات کا نکالا۔ تار کے سرے پر ایک دوسری ڈبیہ میں سے ذرا سی دوائی لگائی اور اُس تار کو ماسٹر صاحب کے حلق سے نیچے اُتارنا شروع کیا۔ جب کافی اُتار چکے تو تار سینہ پر جا کر آخر ٹھہر گیا۔ اب ڈاکٹر صاحب نے احتیاط سے بہت آہستگی کے ساتھ تار کو باہر کھینچنا شروع کیا، یہاں تک کہ پورا تار باہر آ گیا۔

جب تار باہر آ گیا تو ماسٹر صاحب نے نہایت ہی حیرت کے ساتھ دیکھا کہ اس کے سرے پر جہاں دوائی لگائی تھی ایک بہت ہی چھوٹا کیڑا چمٹا ہُوا ہے جو زندہ تھا اور حرکت کر رہا تھا۔

اس عجیب وغریب عمل کے بعد ڈاکٹر صاحب فرمانے لگے ''بس ماسٹر صاحب! اٹھ کر بیٹھ جایئے اب آپ بالکل تندرست ہیں یہی دِق تھی جو آپ کے سینہ پر چمٹی ہوئی تھی اور یہی کیڑا تھا جو اِس غلط تشخیص کا باعث بنا ہُوا تھا اور اس ہی کی وجہ سے آپ کو بخار بھی رہتا تھا اور طبیعت بھی مضمحل رہتی تھی۔ انشااللہ اب ان میں سے کوئی بات نہ ہو گی۔ آپ بخوشی اپنے گھر جا سکتے ہیں۔''

ماسٹر صاحب نے رُک رُک کر فرمایا ڈاکٹر صاحب! بہت ممکن ہے کہ ابھی اور کوئی کیڑا چمٹا ہُوا ہو اور تھوڑے دنوں کے بعد پھر میری وہی حالت ہو جائے۔'' اس پر ڈاکٹر صاحب مسکرائے اور کہنے لگے ''ماسٹر صاحب یہ آپ کا خیال ہی خیال ہے اب کوئی کیڑا اندر نہیں رہا۔ اگر ہوتا تو اس دوائی پر لگا چلا

آتا۔ تاہم آپ کا پورا اطمینان کیئے دیتا ہوں۔''

یہ کہہ کر ڈاکٹر صاحب نے پھر وہی تار دوائی لگا کر ماسٹر صاحب کے حلق میں سے نیچے اُتارا۔ اب جو اُسے نکالا تو بالکل صاف تھا۔

ماسٹر صاحب راستہ بھر یہ سوچتے چلے آئے کہ ڈاکٹر کیسا عجیب انسان ہے اور وہ کس حیرت انگیز فراست کے ساتھ مرض کی تہہ تک پہنچ گیا۔ وہ اب تک بھی کہا کرتے ہیں کہ غلط تشخیص سے میں مرنے کے بالکل قریب ہوگیا تھا مگر صحیح تشخیص اور درست علاج سے دوبارہ زندہ ہوگیا۔

# اظہارِ تشکّر

محترم حکیم محمد رفیع ناصر صاحب (ناصر دواخانہ ربوہ) اِس کتاب کی اشاعت میں مالی معاونت کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

کہ میرے والد محترم میاں محمد شفیع صاحب مرحوم لاہور پولیس میں ملازم تھے۔ اور میرے چچا قادیان جا کر احمدیت قبول کر چکے تھے......

میری پیدائش 1928ء کی ہے والدہ محترمہ رسول بی بی صاحبہ 1930ء میں وفات پا گئی تھیں میرے والد صاحب مجھے بتایا کرتے تھے۔ کہ ایک دِن تمہاری والدہ نے مجھے کہا کہ ''ہمیں قادیان جا کر بیعت کر لینی چاہئے۔ جن کی مخالفت ہوتی ہے وہ سچے ہوتے ہیں'' تو میں نے کہا کہ آج کے بعد میں تمہارے منہ سے یہ بات نہ سنوں۔

میری والدہ کی وفات کے بعد والد محترم پولیس کی ملازمت چھوڑ کر قادیان چلے گئے اور احمدیت قبول کرنے کی سعادت پائی۔ الحمدللہ اب میرے بیٹے عبدالسمیع حامی دارالصدر جنوبی کے صدر ہیں۔

ہم حکیم صاحب کی اس پیشکش پر اُن کے شکرگذار ہیں اور دعا گو ہیں۔ کہ اللہ تعالیٰ اُن کے والدین کے درجات بلند فرمائے آمین۔ اور اہلِ خاندان کو نسلاً بعد نسلٍ اپنی رضا کی راہوں پر چلائے۔

آمین اللھم آمین

فجزاھم اللہ تعالیٰ احسن الجزاء فی الدارین خیراً

شعبہ اشاعت لجنہ اماءاللہ کراچی

نام کتاب............ آپ بیتی
مصنف .................... حضرت ڈاکٹر میر محمد اسمٰعیل صاحب
مرتبہ........امۃ الباری ناصر
ناشر ..............لجنہ اماءِ اللہ ضلع کراچی
شمارہ نمبر ............86
طبع ...............اوّل کراچی سے
تعداد ..............1000
کمپوزنگ ..........وحید منظور میّر
پرنٹر ..............وائی آئی پریس

**Aap Beeti,**
**By**
Hadhrat Dr. Meer Mohammad Ismaa'eel"

Published by : **Lajna Ima'illah Karachi**

Printed by : Y.I. Press Karachi

# دُعائے مَن

حضرت ڈاکٹر میر محمد اسمٰعیل صاحب کے منظوم کلام سے چند اشعار

تو ہی دوا ، تو ہی طبیب ، تُو ہی مُحِبّ تُو ہی حبیب
خدائے من، خدائے من، قبول کُن دُعائے من

زمین و آسماں کا نُور ، مکاں و لا مکاں سے دُور
ہمہ صِفَت ، ہمہ سُرور ، خدائے ذُوالجلالِ طُور
قبول کر دُعا ضرور ، مِرے خدا ، مِرے غَفور
خدائے من ، خدائے من قبول کُن دُعائے من

معاف کر سزا مِری ، گناہ مِرے جفا مِری
قبول کر دُعا مِری ، صدا و اِلتجا مِری
کہ بخشتا نہیں کوئی ، سِوا ترے خطا مِری
خدائے من ، خدائے من قبول کُن دُعائے من

ہماری تو پُکار سُن ، صدائے اَشکبار سُن
نوائے بیقرار سُن ، نِدائے اِضطِرار سُن
دُعائے شرمسار سُن ، اَے میرے غمگسار سُن
خدائے من ، خدائے من قبول کُن دُعائے من

گناہ سے ہم کو دور رکھ ، دِلوں کو پُرزِ نُور رکھ
نشے میں اپنے چُور رکھ ، ہمیشہ پُرسُرور رکھ
نظر کرم کی ہم پہ تُو ، ضرور رکھ ، ضرور رکھ
خدائے من ، خدائے من قبول کُن دُعائے من

پڑھیں کلامِ حق بشَوق ، عبادتوں میں آئے ذَوق
اُتار غفلتوں کے طَوق ، اُڑیں فضامیں فَوق فَوق (جاری)

# فہرست کتب

# صد سالہ خلافت جوبلی کا روحانی پروگرام

سیدنا حضرت خلیفۃ المسیح الخامس ایدہ اللہ تعالیٰ بنصرہ العزیز نے صد سالہ خلافت جوبلی کا جو روحانی پروگرام عطا فرمایا ہے براہِ کرم اُس پر بھرپور طریق سے عمل کریں:-

1- ہر ماہ ایک نفلی روزہ رکھا جائے جس کے لئے ہر قصبہ، شہر یا محلہ میں مہینہ کے آخری ہفتہ میں کوئی ایک دن مقامی طور پر مقرر کر لیا جائے۔

2- دو نفل روزانہ ادا کئے جائیں جو نماز عشاء کے بعد سے لے کر فجر سے پہلے تک یا نماز ظہر کے بعد ادا کئے جائیں۔

3- سورۃ الفاتحہ۔ (روزانہ کم از کم سات مرتبہ پڑھیں)

4- رَبَّنَا اَفْرِغْ عَلَيْنَا صَبْرًا وَّثَبِّتْ اَقْدَامَنَا وَانْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكَافِرِيْنَ. (2:251) (روزانہ کم از کم 11 مرتبہ پڑھیں)

ترجمہ: اے ہمارے رب! ہم پر صبر نازل کر اور ہمارے قدموں کو ثبات بخش اور کافر قوم کے خلاف ہماری مدد کر۔

5- رَبَّنَا لَا تُزِغْ قُلُوْبَنَا بَعْدَ اِذْ هَدَيْتَنَا وَهَبْ لَنَا مِنْ لَّدُنْكَ رَحْمَةً اِنَّكَ اَنْتَ الْوَهَّابُ. (3:9) (روزانہ کم از کم 33 مرتبہ پڑھیں)

ترجمہ: اے ہمارے رب! ہمارے دلوں کو ٹیڑھا نہ ہونے دے بعد اس کے کہ تو ہمیں ہدایت دے چکا ہو اور ہمیں اپنی طرف سے رحمت عطا کر۔ یقیناً تو ہی ہے جو بہت عطا کرنے والا ہے۔

6- اَللّٰهُمَّ اِنَّا نَجْعَلُكَ فِيْ نُحُوْرِهِمْ وَنَعُوْذُبِكَ مِنْ شُرُوْرِهِمْ. (روزانہ کم از کم 11 مرتبہ پڑھیں)

ترجمہ: اے اللہ ہم تجھے ان (دشمنوں) کے سینوں میں کرتے ہیں (یعنی تیرا رعب ان کے سینوں میں بھر جائے) اور ہم ان کے شر سے تیری پناہ چاہتے ہیں۔

7- اَسْتَغْفِرُ اللّٰهَ رَبِّيْ مِنْ كُلِّ ذَنْبٍ وَّاَتُوْبُ اِلَيْهِ. (روزانہ کم از کم 33 مرتبہ پڑھیں)

ترجمہ: میں بخشش مانگتا ہوں اللہ سے جو میرا رب ہے ہر گناہ سے اور میں جھکتا ہوں اس کی طرف۔

8- سُبْحَانَ اللّٰهِ وَبِحَمْدِهٖ سُبْحَانَ اللّٰهِ الْعَظِيْمِ. اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰى مُحَمَّدٍ وَّاٰلِ مُحَمَّدٍ. (روزانہ کم از کم 33 مرتبہ پڑھیں)

ترجمہ: اللہ تعالیٰ پاک ہے اپنی حمد کے ساتھ اللہ پاک ہے اور بہت عظمت والا ہے اے اللہ رحمتیں بھیج محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کی آل پر۔

9- مکمل درود شریف۔ (روزانہ کم از کم 33 مرتبہ پڑھیں)

........................................

# سیدالاستغفار پڑھنے کی تحریک

## ارشاد حضرت خلیفۃ المسیح الرابع ایدہ اللہ تعالیٰ بنصرہ العزیز

سیدنا حضرت خلیفۃ المسیح الرابع ایدہ اللہ تعالیٰ بنصرہ العزیز نے مورخہ 31/دسمبر 1998ء کو عالمی درس قرآن میں فرمایا کہ رمضان کا مہینہ استغفار کا مہینہ ہے۔ بہت لوگ حاجت روائی کے لئے خط لکھتے ہیں۔ ان کو یاد رہے کہ حاجت براری سے پہلے استغفار ضروری ہے۔ رسول کریم ﷺ کا وعدہ ہے کہ پھر ان کو رزق دیا جائے گا اور تنگیاں دور کر دی جائیں گی۔ آنحضرت ﷺ نے فرمایا اس شخص کو مبارک ہو جس کے نامہ اعمال میں استغفار بہت پایا گیا۔ حضور ایدہ اللہ نے فرمایا جو اِستغفار عام لوگ کرتے ہیں وہ اس سے بہت مختلف جو آنحضرت ﷺ فرمایا کرتے تھے۔ اس ضمن میں حضور ایدہ اللہ نے بخاری کتاب الدعوات سے آنحضرت ﷺ کا اِستغفار پیش فرمایا اور فرمایا یہ بہت اعلیٰ مضمون ہے جن احباب جماعت کو اس کا عربی متن یاد رکھنا مشکل ہو اس کا ترجمہ اور مضمون حاضر رکھیں اور اپنے الفاظ میں اِستغفار کیا کریں۔ یہ سید الاستغفار ہے اس کو رمضان کے تحفے کے طور پر یاد رکھیں۔

آنحضرت ﷺ نے فرمایا ہے کہ جو کوئی یقین کے ساتھ دن کو یہ دعا کرے اور شام سے پہلے مر جائے تو وہ اہل جنت میں سے ہوگا۔ اسی طرح جو شخص رات کو یہ دعا کرے اور صبح ہونے سے پہلے مر جائے تو وہ بھی اہل جنت میں شامل ہوگا۔ (الفضل 12/جنوری 1999ء)

ذیل میں سیدالاستغفار کا اصل متن اور ترجمہ درج کیا جا رہا ہے۔

**اَللّٰھُمَّ اَنْتَ رَبِّی، لَا اِلٰہَ اِلَّا اَنْتَ، خَلَقْتَنِیْ، وَاَنَا عَبْدُکَ وَاَنَا عَلٰی عَھْدِکَ، وَوَعْدِکَ مَا اسْتَطَعْتُ، اَعُوْذُبِکَ مِنْ شَرِّمَا صَنَعْتُ اَبُوْءُ لَکَ بِنِعْمَتِکَ عَلَیَّ وَاَبُوْءُ بِذَنْبِیْ، فَاغْفِرْلِیْ فَاِنَّہٗ، لَا یَغْفِرُ الذُّنُوْبَ اِلَّا اَنْتَ**

(صحیح بخاری کتاب الدعوات باب افضل الاستغفار حدیث نمبر 5831)

ترجمہ: اے اللہ! تو میرا ربّ ہے، تیرے سوا کوئی معبود نہیں، تو نے ہی مجھے پیدا کیا ہے اور میں تیرا بندہ ہوں اور میں حسب توفیق تیرے عہد اور وعدے پر قائم ہوں، میں اپنے عمل کے شر سے تیری پناہ میں آتا ہوں، میں اپنی ذات پر تیری نعمتوں اور احسانوں کا اعتراف کرتا ہوں اور اپنے گناہوں کا بھی اعتراف کرتا ہوں۔ پس تو مجھے بخش دے کیونکہ تیرے سوا کوئی گناہوں کو بخشنے والا نہیں۔